عنایت اللہ
کالا برقع جل رہا تھا
جرم و سزا کی چار سچی کہانیاں
مکتبہ داستان
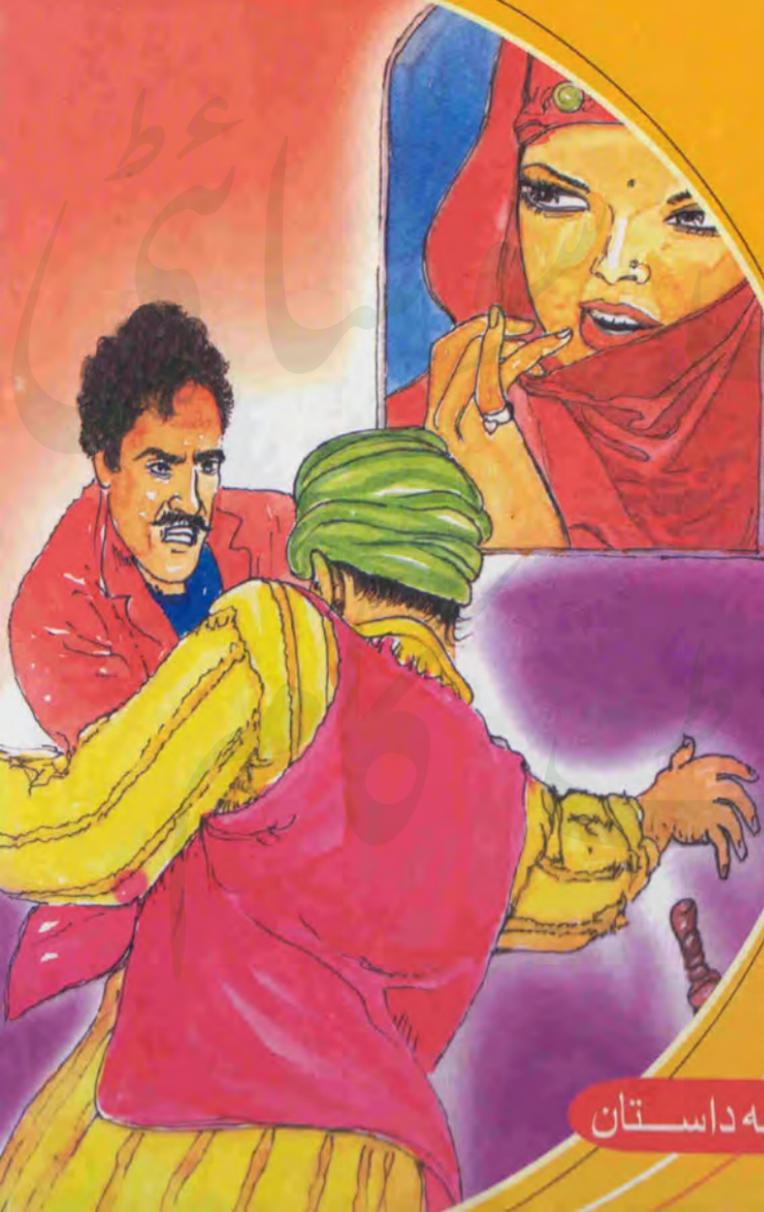
فہرست

کیا شانتی شکیلہ تھی؟

سورج طلوع ہو رہا تھا جب میں تھانے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک انسانی کھوپڑی اور چند ہڈیوں پر پڑی جو برآمدے میں میرے دفتر کے سامنے فرش پر پڑی تھیں۔ میرا ہیڈ کانسٹیبل اور تین چار کانسٹیبل قریب کھڑے ہنس رہے تھے اور اُن کے پاس میرے تھانے کے کسی گاؤں کا چوکیدار کھڑا تھا۔ میں نے تمام نمبرداروں، چوکیداروں اور مُخبروں کے لئے بڑے سخت احکام جاری کر رکھے تھے۔ ان احکام کا یہ اثر تھا کہ اس چوکیدار کو کسی ویرانے میں یہ کھوپڑی اور کچھ ہڈیاں پڑی نظر آئیں تو اکٹھی کر کے تھانے میں لے آیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک سو سال پہلے مرے ہوتے کسی انسان کی کھوپڑی تھی۔

میں چوکیدار کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اُسے شاباش دی اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ یہ ہڈیاں پچھلے کمرے میں رکھ دے۔ چوکیدار چلا گیا تو میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ جاہل کا بچّہ معلوم نہیں یہ کہاں سے اٹھا لایا ہے۔ باہر کہیں گڑھا کھود کر انہیں دفن کر دینا۔

"ملک صاحب!" ایک کانسٹیبل نے ہنس کر کہا — "آپ ہی نے سب کو کہہ رکھا ہے کہ کہیں کوئی مشکوک چیز، مشکوک انسان، مشکوک واقعہ نظر آئے، فوراً تھانے میں اطلاع دی جائے۔"

میں وہمی تو نہیں تھا، لیکن تھانے میں داخل ہوتے ہی کھوپڑی دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ہندوؤں کی طرح میں بھی ڈر گیا کہ یہ اچھا شگون نہیں۔ شاید یہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کا اثر تھا۔ اُدھر سے ہیڈ کانسٹیبل کھوپڑی اور ہڈیاں پچھلے کمرے میں رکھ کر واپس آیا اِدھر سے ایک گاؤں

کانمبردار جسے مکھیا بھی کہا کرتے تھے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کی چال بتا رہی تھی کہ اچھی خبر نہیں لایا خبر واقعی اچھی نہیں تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گاؤں سے تھوڑی دُور ایک ہندو کی لاش پڑی ہے۔ اُسے وہ جانتا تھا۔ وہ میرے شہر کے ایک آڑھتی کا بیٹا تھا۔ یہ آڑھتی ساہوکارہ بھی کرتا تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ مرنے والے کو گزشتہ روز صبح کے وقت ٹٹو پر جاتے دیکھا گیا تھا۔ وہ آگے کسی گاؤں کو جا رہا تھا۔ آج صبح کسی نے اُس کی لاش پڑی دیکھی تو اُس نے نمبردار کو جا بتایا۔

میں نے آڑھتی کو بلوالیا۔ اُس سے اُس کے بیٹے کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ کل وہ تین گاؤوں سے وصولیوں کے لئے گیا تھا۔ شام تک اُسے واپس آجانا چاہیئے تھا لیکن نہیں آیا۔ گزشتہ رات پہلے پہر بارش برسنے لگی تھی۔ باپ نے خیال ظاہر کیا کہ فلاں گاؤں میں اُس کا ایک بھائی (مقتول کا چچا) رہتا ہے۔ بارش کی وجہ سے اُس کا بیٹا وہاں رُک گیا ہوگا۔ باپ نے کہا کہ اُس نے عقل مندی سے کام لیا ہے کہ وہیں رُک گیا ہے۔ وصولیوں کی رقم کے ساتھ شام کے وقت اکیلے آنا خطرناک تھا۔

میں نے اُسے فوراً نہیں بتایا کہ اُس کے بیٹے نے عقل مندی سے کام نہیں لیا اور وہ وصولیوں کی رقم رہزنوں کو دے بیٹھا اور قتل ہو چکا ہے۔ فوری طور پر میرے دماغ میں یہی آئی تھی کہ آڑھتی کا بیٹا تین گاؤوں سے وصولی کر کے شام کے بعد واپس آرہا ہوگا کہ رہزنوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ اُس نے خاموشی سے رقم اُن کے حوالے کرنے کی بجائے مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہوگی ورنہ رہزن قتل سے عموماً گریز کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کے کسی مقروض نے ہی اُس سے رقم چھین کر مار ڈالا ہو۔ ہندو ساہوکاروں کا رویّہ سُود خور پٹھانوں جیسا ہوتا ہے۔ حاجت مند لوگ اُن سے سُود پر قرض لیا کرتے تھے۔ سُود کا حساب کتاب ایسا ہوتا تھا کہ قرض دار ساری عمر سُود ہی ادا کرتے رہتے تھے۔ ساہوکار ہر ماہ وصولی کے لیے اُنہیں بہت پریشان کرتے تھے۔

آڑھتی نے پریشان ہو کر مجھ سے پُوچھا کہ میں اُس کے بیٹے کے متعلق کیوں پُوچھ رہا ہوں۔ میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اُسے نمبردار اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ موقعۂ واردات کی طرف روانہ کر دیا۔

میں جب وہاں پہنچا تو ساہوکار آڑھتی کی دھاڑیں دُور دُور تک سُنائی دے رہی تھیں۔ لوگ جمع ہو چکے تھے جنہیں قریب نہیں آنے دیا گیا تھا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ نمبردار نے اُوپر کمبل ڈال دیا تھا۔ کمبل ہٹا کر دیکھا۔ یہ ایک جوان آدمی کی لاش تھی۔ جسم دُبلا تھا۔ میں نے سب سے پہلے جامہ تلاشی لی۔ اُس نے کُرتہ پہن رکھا تھا جس کی ایک ہی جیب تھی۔ یہ پہلو میں تھی۔ اس میں سے پانچ چھ روپے اور کچھ آنے نکلے۔ اُس کے باپ نے بتایا کہ اُس کے پاس روپوں کی تھیلی ہونی چاہیئے تھی جسے ہم پنجابی میں گتھی کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں نوٹ کم اور روپے کے سکّے زیادہ ہوتے تھے، اس لیے رقم تھیلیوں میں اٹھائی جاتی تھی۔ لاش کے ساتھ یا ارد گرد کوئی تھیلی نہیں تھی۔ باپ نے بتایا کہ وہ ٹٹّو پر گیا تھا جو کرائے پر لیا گیا تھا۔ وہاں ٹٹو بھی نہیں تھا۔

میری نگاہ میں یہ رہزنی کی واردات تھی۔ میں نے لاش پر ضربات کا معائنہ کیا۔ کپڑوں پر کہیں بھی خون نہیں تھا۔ اُس کا سر مُنڈھا ہُوا تھا۔ وہاں بھی مجھے کسی زخم یا چوٹ کا نشان نظر نہیں آیا۔ لاش کا منہ جس طرح کھُلا ہُوا تھا اس سے موت کا باعث معلوم ہوتا تھا۔ میں نے گردن دیکھی۔ سامنے والے حصّے پر صاف نشان تھے جو واضح کرتے تھے کہ گلا ہاتھوں سے دبایا گیا ہے۔ کسی لاش کی گردن پر یہ نشان ہوں تو جسم پر زخم یا ضرب کے نشان عموماً نہیں ہوتے۔ گلا اُسی صورت میں دبایا جاتا ہے جہاں قاتل کے پاس ہتھیار نہ ہو یا وہ خون کے چھینٹوں سے بچنے کے لئے ہتھیار استعمال نہ کرنا چاہتا ہو۔ بہرحال یہ دیکھنا ڈاکٹر کا کام تھا کہ جسم پر کوئی زخم یا ضرب ہے یا نہیں اور موت کا باعث کیا ہے۔

میں نے تفتیش کی بنیاد باندھنے کے لیے معائنہ کر لیا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ رات نو بجے کے لگ بھگ مینہ برسا تھا جس نے پاؤں کا ایک بھی نشان نہیں رہنے دیا تھا۔ اگر وہاں تک مقتول ٹٹو پر سوار تھا تو ٹٹو کا بھی کوئی کھرا نہیں تھا۔ کھوجی میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بارش نے زمین سے ساری شہادت دھو ڈالی تھی۔ بارش سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کوئی درندہ باہر نہیں نکلا، ورنہ لاش پہچاننے کے قابل بھی نہ رہتی۔

انگوٹھی میں عورت کے بال

میں نے اب لاش کو اس اُمید کے ساتھ غور سے دیکھنا شروع کیا کہ قاتل کی کوئی نشانی مل جائے گی۔ عام طور پر یُوں ہوتا ہے کہ قاتل موقعۂ واردات پر کوئی ایسی نشانی چھوڑ جاتا ہے جو سراغرسانی میں مدد دیتی ہے۔ اس کے لئے غیر معمولی طور پر تیز نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض نشانیاں ایسی ہوتی ہیں جن پر نظر کم ہی پڑتی ہے۔

میں نے لاش کے اردگرد کچھ دُور تک دیکھا۔ کچھ نہ ملا۔ اس کے کپڑوں کو دیکھا۔ ہاتھ دیکھے۔ انگلیاں اور ناخن دیکھے۔ جب میں نے اُس کے بائیں ہاتھ کو ہاتھ میں لیا تو ایک چیز مل گئی۔ یہ اُس کی انگوٹھی میں پھنسے ہوئے تین بال تھے۔ ایک بال کم و بیش ایک فٹ لمبا تھا۔ دُوسرا اس سے دو تین انچ کم اور تیسرا اس سے بھی کم لمبا تھا۔ یہ بال بلاشک و شبہ کسی عورت کے تھے۔ اس کی انگوٹھی اُوپر سے کشتی نما تھی۔ یہ فیشن انہی دنوں شروع ہُوا تھا۔ شادی کی انگوٹھیاں اسی شکل کی بنتی تھیں۔ یہ فیشن زنانہ تھا لیکن مَردوں نے بھی ایسی انگوٹھیاں پہن لی تھیں۔ مقتول کی شادی دو سال پہلے ہُوئی تھی۔ اُس کے باپ نے بتایا تھا کہ یہ اُس کی شادی کی انگوٹھی تھی۔ کشتی نما حصے میں جالی سی بنی ہوئی تھی جس میں سے

ایک تار ٹوٹ گیا تھا۔ بال اس تار نے پکڑے تھے۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ بال کسی سکھ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ رہزن سکھ ہو گا۔ اُس نے مقتول کا گلا دبایا تو مقتول نے اُس کے بال پکڑ لیے ہوں گے، لیکن میں نے اپنے اس خیال کو قبول نہیں کیا۔ ایک اس لیے کہ سکھ بال کھُلے نہیں رکھتے۔ پگڑی کس کر باندھتے ہیں۔ دُوسرے اس لیے کہ اس علاقے میں کوئی سکھ رہزن میرے ریکارڈ پر نہیں تھا۔ یہ بال باریک تھے۔ عورت کے ہی ہو سکتے تھے۔ مجھے بہرحال سَو فی صد یقین تھا کہ یہ عورت کے بال ہیں۔ انگوٹھی کو دیکھ کر ہی مجھے خیال آیا کہ رہزنوں کو سونے کی یہ انگوٹھی نظر نہیں آئی اور اُنہوں نے لاش کی جیب بھی نہیں دیکھی جیب میں بھی کچھ رقم تھی۔ میں نے اس کی وجہ یہ سوچی کہ انہیں روپوں کی تھیلی مل گئی تھی اس لیے انہوں نے کسی اور طرف دھیان نہ دیا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی اور بال لپیٹ کر جیب میں رکھ لیے۔ میں نے نمبردار کو پرے لے جا کر مُخبری کے متعلق ضروری ہدایات دیں اور واپسی کے دوران سوچتا رہا۔ لاش قصبے سے ڈیڑھ پونے دو میل دُور سے ملی تھی۔ یہ شہر دراصل قصبہ تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ یہ رہزنی کی واردات نہیں۔ رہزن گلا نہیں دبایا کرتے تھے۔ یہ سوچ بھی آئی کہ مقتول ہندو تھا، بلکہ ہندو بنیا جس سے اس دلیری کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اُس نے رہزن یا رہزنوں کا مقابلہ کیا ہو گا۔ اُس زمانے کے رہزن اور ڈاکو ایسے تھے کہ لوگ اُن کے نام سے ہی ڈر جاتے تھے۔ بال عورت کے تھے اور عورت رہزن نہیں ہو سکتی تھی۔

مقتول کا باپ میرے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا بیٹا کتنا کچھ دلیر تھا۔ اُس نے بتایا کہ خاص طور پر دلیر نہیں تھا۔ کاروبار میں تیز تھا۔ پھر میں نے اُس کے چال چلن کے متعلق پُوچھا۔ باپ نے جواب دیا کہ مقتول شادی شدہ تھا۔ اس میں کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ اُس کی کسی کے ساتھ دوستی بھی نہیں تھی اور دشمنی بھی نہیں تھی۔ میں باپ

سے امید نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ کہتا کہ اُس کے بیٹے کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اُس کی دوستی تھی؟ باپ نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے تو وہ سائے سے بھی دُور بھاگتا تھا۔

پوسٹ مارٹم کا انتظام شہر میں ہی تھا۔ میں تھانے میں داخل ہُوا تو دن کا تیسرا پہر گزر رہا تھا۔ کاغذی کارروائی مکمل کی اور سول ہسپتال چلا گیا۔ پوسٹ مارٹم میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ رپورٹ یہ تھی کہ مقتول کو مرے تقریبًا بیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پوسٹ مارٹم بارہ بجے شروع ہُوا تو موت کا وقت گزشتہ روز چار بجے بعد دوپہر تھا۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ موت دو اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ معدے میں کھانے کی جو اشیا رہ گئی تھیں وہ اس نے نوٹ کر لی تھیں۔ اُس نے رائے دی کہ یہ خوراک دوپہر کی ہو سکتی ہے۔

میں نے ڈاکٹر کو حیران ہو کر دیکھا اور کہا بھی کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ لاش کل بعد دوپہر کی وہاں پڑی رہی اور کسی نے دیکھی نہیں۔ کوئی انسان نہ دیکھتا تو گدھ فورًا پہنچ جاتے۔ بارش رات نو بجے شروع ہوئی جو تیز بھی اور بجلی بھی چمکتی اور کڑکتی تھی۔ ایسے موسمی حالات میں کوئی مُردار خور درندہ باہر نہیں نکلتا۔ قتل کا وقت رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہونا چاہیئے، لیکن ڈاکٹر کو اپنی رائے پر پورا اعتماد تھا۔ اُس نے کہا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُسے کہیں اور قتل کیا گیا اور لاش رات اُس وقت باہر پھینکی گئی جب بارش شروع ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر نے موت کا باعث دم گھٹنا لکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اُسے گلا دبا کر قتل کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کے ساتھ بحث مباحثے اور تبادلۂ خیالات کے بعد میں نے تسلیم کر لیا کہ مقتول کو گذشتہ شام سے پہلے قتل کیا گیا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ قتل کہیں اور کیا گیا اور لاش یہاں پھینکی گئی ہو۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ واردات رہزنوں کی نہیں بلکہ ان کی ہو سکتی ہے جن کے پاس مقتول وصولیوں کے لیے گیا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان ساہوکاروں سے غریب لوگ قرض لیا کرتے تھے جسے وہ بیاہ شادیوں اور مقدمہ بازی پر خرچ کرتے تھے۔

ہندو ساہوکاروں کا قرض ایسا جال ہوتا تھا جس میں پھنسا ہُوا مقروض ساری عمر نہیں نکل سکتا تھا۔ بعض بدکردار ساہوکار یا اُن کے بیٹے اپنے قرض کے جال میں پھنسائے ہوئے لوگوں کو پریشان کر کے اُن کی بہن بیٹیوں اور بیویوں سے دست درازیاں بھی کر گزرتے تھے۔ ہندو کسان ایک ماہ کی وصولی رکوانے کے لئے یا کسی اور رعایت کی خاطر اپنی عزت ساہوکاروں کے حوالے کر کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے اُن کا رویّہ ناقابلِ برداشت ہوتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ شک پیدا ہُوا کہ مقتول کسی مسلمان کے گھر بدتمیزی کر کے جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو گا۔

یہ شک پختہ ہونے لگا کہ قرض خور نے ہی اُسے پار کر دیا ہے۔ میرے لئے ضروری ہو گیا کہ میں اُن لوگوں کو دیکھوں جن کے ہاں مقتول گیا تھا۔ میرے ان شکوک کو وہ تین بال پکا کر رہے تھے جو مقتول کی انگوٹھی میں پھنسے ہُوئے برآمد ہوئے تھے۔ اس سے پہلے میں دو مختلف تھانوں کی دو وارداتوں میں بال دیکھ چکا تھا۔ ایک مقتول کی لاش کی مُٹھی میں زنانہ بال تھے اور دوسرے مقتول کے کپڑوں سے ایک بال ملا تھا۔ لاش کے ساتھ زنانہ بال کی کھال اتاری جائے تو تفتیش آسان ہو جاتی ہے۔ کم از کم یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قاتل عورت ہے یا عورت ساتھ تھی۔

اس واردات میں بھی بال تھے جو کچھ ایسی کہانی سُنا رہے تھے کہ مقتول نے کسی عورت پر ہاتھ ڈالا ہے اور اسی عورت کے ہاتھوں یا اس عورت کے کسی بھائی یا خاوند کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ روپوں کی تھیلی کا لاپتہ ہونا قدرتی بات تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اُسے کسی نے اس تھیلی کی خاطر ہی قتل کیا ہو۔

میں شام کے بعد ساہوکار آڑھتی کے گھر جانا چاہتا تھا لیکن صبح کے لئے ملتوی کر دیا کیونکہ لاش اُس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ میں ماتم والے گھر لوگوں کے ہجوم میں تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔

میں اگلے روز اُس وقت وہاں گیا جب لاش کو جلایا جا چکا تھا۔

گھر میں اُس کے باپ کے علاوہ ماں تھی۔ ایک بڑا بھائی، ایک چھوٹا بھائی، مقتول کی بیوی اور ایک بچّہ اور ایک جوان لڑکی تھی جس کے متعلق بتایا گیا کہ مقتول کی غیر شادی شدہ بہن ہے۔ اس لڑکی کی عمر تیئیس سال بتائی گئی۔ خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے سب سے باری باری مقتول کے چال چلن اور دوستی اور دشمنی کے متعلق کُرید کُرید کر پوچھا لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو میری مدد کرتی۔ اس کی بیوی کو الگ بٹھا کر پوچھا۔ وہ کوری سلیٹ نکلی۔ اُس کے تو ہوش ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ اُس کے لئے ساری عمر کی بیوگی رہ گئی تھی۔ ہندو عورت دوسرا خاوند کر ہی نہیں سکتی۔ یہ لڑکی بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔

اُس کی بہن سے کچھ پُوچھنا بیکار تھا۔ وہ اُس کی باہر کی زندگی کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ البتہ مقتول کی ازدواجی زندگی کے متعلق وہ کوئی انکشاف کر سکتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو کمرے میں بُلایا تو اُس کے رویّے میں بے رُخی اور لاپرواہی سی دیکھی۔ اُس کا جوان بھائی مر گیا تھا مگر اپنی ماں کی طرح یا اپنی بھابھی کی طرح وہ رو نہیں رہی تھی۔ میں نے ہمدردی کے اظہار سے بات شروع کی اور آہستہ آہستہ اپنی تفتیش کی طرف آیا۔ بہت سوال و جواب ہوئے۔ اُس نے کہا کہ گاؤں میں جاتا رہتا تھا۔ کسی کو چھیڑ بیٹھا ہو گا۔ میں نے لڑکی کو اسی فقرے پر جکڑے رکھنے کے لئے بہت سی باتیں پوچھیں اور جرح بھی کی لیکن لڑکی نے میری طرح شک کا اظہار کیا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکی اپنے کنبے سے مختلف ہے۔

میں نے اس سے ایک ذاتی سا سوال پُوچھا کہ وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے، اس کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہُوئی۔ اُس علاقے کے ہندو چودہ پندرہ سال کی عمر میں لڑکیوں کو بیاہ دیا کرتے تھے۔ اس کی عمر تیئیس سال ہو چکی تھی۔ بہرحال یہ اس گھرانے اور اس لڑکی کے ذاتی معاملات تھے۔ میرے دماغ پر واردات کی تفتیش سوار تھی۔ اس لڑکی کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ یہ مجھے اپنے گھرانے کے تمام افراد سے مختلف لگتی تھی۔

میں نے مقتول کے باپ سے کہا کہ وہ کل صبح ٹٹو یا گھوڑے کا انتظام کر کے صبح سویرے تھانے پہنچ جائے۔ اُسے اُن گھروں تک لے جانا تھا جہاں مقتول وصولیوں کے لیے گیا تھا۔ یہ ذرا لمبا سفر تھا۔ تین مختلف گاؤں تھے۔ شہر سے دو سے چار میل تک دُور تھے۔ ان کا آپس میں بھی دو دو میل کا فاصلہ تھا۔ مقتول کے باپ کو معلوم تھا کہ مقتول کو کہاں کہاں جانا تھا۔

اُدھر کو جدھر مقتول گیا تھا

اگلی صبح میرا قافلہ دیہات کی طرف چل پڑا۔ ہم سب سے پہلے قریبی گاؤں میں گئے۔ وہاں مقتول کو دو گھروں میں جانا تھا۔ میں باری باری دونوں گھروں میں گیا۔ مقتول ان سے وصولیاں کر کے چلا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ کہاں سے اُس نے کتنی رقم وصول کی تھی۔ مجموعی طور پر چار سَو کے قریب تھی۔ میں نے دونوں گھروں کے تمام افراد کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔ ایک گھر میں ایک جوان بیوی تھی۔ میں نے اپنے انداز سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مقتول نے اس پر دست درازی تو نہیں کی تھی۔ مجھے کوئی ایسا اشارہ نہ ملا جس سے میرا یہ شک پختہ ہوتا۔ بلکہ شک اس طرح رفع ہو گیا کہ گاؤں کے کچھ لوگوں سے پُوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ مقتول دونوں گھروں کے اندر نہیں گیا۔ باہر کھڑے کھڑے اُسے رقم مل گئی تھی اور وہ ٹٹو پر سوار ہو کر چلا گیا تھا۔ اُسے چائے پانی کے لیے رُکنے کو کہا گیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر چل پڑا تھا کہ فلاں فلاں گاؤں میں بھی جانا ہے اور شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری ہے۔

وہاں سے ہم دوسرے گاؤں گئے۔ وہاں بھی دو گھر تھے جہاں سے اُسے وصولیاں کرنی تھیں۔ دونوں گھروں سے پتہ چلا کہ مقتول وہاں گیا ہی نہیں۔ اس سے مجھے کچھ شک ہُوا۔ میں نے گہری تفتیش شروع کر دی۔ گاؤں سے بھی معلوم کرایا۔ وہ واقعی وہاں نہیں گیا تھا۔ اُسے جن کے پاس جانا تھا اُنہوں نے

اُس کے باپ سے کما کر رقم لے جاتے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ باہر کے کسی
آدمی کا وہاں جانا چُھپ نہیں سکتا تھا۔
وہاں سے چلنے لگے تو ایک آدمی نے بتایا کہ وہ شہر سے آرہا تھا۔
اُس نے مقتول کو فلاں گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ ٹٹو پر سوار تھا۔
اس سے یہ پتہ چل گیا کہ وہ ادھر آیا ہی نہیں۔ وہ جس گاؤں کی طرف جاتا دیکھا
گیا تھا وہ ذرا بڑا گاؤں تھا۔ مقتول کے باپ نے بتایا کہ اس گاؤں میں اُس
کا ایک بھائی رہتا ہے۔ اس کی ایک بیٹی جوان ہے جس کے ساتھ مقتول کی
بہن کی بہت محبت ہے۔ وہ اکثر اس گاؤں میں آتی ہے اور کبھی کبھی رات کو
بھی وہیں رہتی ہے۔ مقتول جب بھی ادھر آتا ہے اپنے چچا کے گھر ضرور جاتا ہے۔
ہم اُس گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ فاصلہ کوئی تین میل تھا۔ راستے
سے کچھ الگ ہٹ کر ایک بڑی ہی خوبصورت جگہ تھی جسے سارے علاقے
کے لوگ باغیچہ کہتے تھے۔ یہ ایک مسلمان کی جاگیر تھی۔ اس نے وہاں باغ بنا
رکھا تھا۔ سبزیوں کا باغ بھی تھا اور ارد گرد دُور دُور تک کھیتیاں اسی کی
ملکیت تھیں۔ مالک شہر میں رہتا تھا۔ یہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی زمین تھی۔
اُس کے آباؤ اجداد نے انگریزوں کی بہت خدمت کی تھی۔ خاندان کے
دو تین آدمی کسی زمانے میں فوج میں تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں لڑے تھے۔ موجودہ
مالک بھی انگریزوں کا زر خرید غلام تھا۔ ان کی خوشنودی کے لیے دین اور
ایمان سے دستبردار ہو جایا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف مُخبری کرنے سے
بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس کا ایک مکان شہر میں تھا اور ایک اُس زمانے کی
نئی طرز کا مکان باغیچے میں یعنی زمینوں پر تھا۔ یہ مکان انگریزوں کی خاطر و مدارات
کے لیے بنایا گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی انگریز شکاری ادھر آتا تھا تو یہ جاگیردار
اُسے اس مکان میں ٹھہراتا تھا۔ اُس کے لئے شراب اور کباب کا اہتمام کرتا
تھا۔ وہاں سے کچھ دُور آگے مرغابی اور چیتل کا بہت شکار تھا۔
باغیچے کے مکان میں باقاعدہ رہائش کسی کی نہیں تھی۔ مالک کا بیٹا
وہاں آتا جاتا رہتا اور ضرورت پڑے تو کچھ دن وہیں رہتا تھا۔ یہ بیٹا جوان

تھا۔ میں اُس کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ آپ اسے زاہد کہہ لیں۔ اس کے
ساتھ میری اچھی جان پہچان تھی۔ زندہ دل آدمی تھا۔ ابھی اس کی شادی
نہیں ہوئی تھی۔ عمر پچیس چھبیس سال ہو چکی تھی۔ جہاں تک میں اُسے جانتا تھا
وہ باپ سے بلکہ آباؤ اجداد سے کچھ مختلف تھا۔ اُس میں مسلمانوں والے وصف
نظر آتے تھے، تاہم میں اُسے پکا مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔ دولت اور جاگیر ہو
تو مذہب اور اخلاق کی کوئی پروا نہیں کیا کرتا۔ زاہد کی ذاتی زندگی کے متعلق
میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ بڑے اچھے جسم والا خُوبرو جوان تھا۔ گھوڑا سواری
اور نیزہ بازی میں مشہور تھا۔ اُس کی ذاتی زندگی قابلِ تعریف ہو ہی نہیں سکتی
تھی جس کی جاگیر پر غریب مزارعے اور اُن کی بیٹیاں مزدوری کریں اور
اُن میں کچھ جوان اور خوبصورت ہوں۔ اس جاگیر کی دیکھ بھال زاہد کے
سپرد تھی۔ باپ انگریزوں کی خوشنودی کا فرض نبھا رہا تھا۔
یہ باغیچہ ایک تو بنایا ہی خوبصورت گیا تھا اور زیادہ تر حُسن اسے
قدرت نے دیا تھا۔ درختوں کی بہتات تھی۔ اس سے دو تین سَو گز دُور
زمین نیچے چلی گئی تھی۔ وہاں بڑے پرانے اور اونچے درخت تھے۔ ان کے
قریب سے ایک ندی بہتی تھی۔ بارشیں نہ ہوں تو ندی کا پانی صاف ستھرا
ہوتا تھا۔ ایک جگہ سے ندی کا کنارہ کٹا ہوا تھا جہاں سے پانی نے باہر
آکر خاصی لمبی چوڑی جھیل بنا رکھی تھی۔ اس جھیل کو درختوں نے نیم دائرے
میں روک رکھا تھا۔ ساتھ چٹان سی تھی۔ جھیل کے قریب تین ساڑھے تین
ایکڑ زمین ہموار تھی۔ وہاں گھاس تھی اور درخت بھی۔ یہ بڑی اچھی سیر گاہ تھی۔
میں تیسرے گاؤں کو جا رہا تھا۔ وہ گاؤں اس باغیچے سے پُورا ایک
میل بھی دُور نہیں تھا۔ اتنی اچھی سیر گاہ کو دیکھے بغیر آگے جانے کو جی نہ
چاہا۔ دماغ تھک گیا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہاں کوئی ہوگا۔ میں اس
ارادے سے اُدھر چلا گیا کہ ذرا گھوم پھر کر آگے جاؤں گا۔
میں اُدھر کو ہو لیا۔ باغیچے کے قریب پہنچا تو زاہد کو دیکھا جو تیز تیز قدم
اٹھاتا میری طرف آرہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ میری پارٹی کے

لوگ ساتھ تھے۔ زاہد نے میری خاطر تواضع کا اہتمام کیا۔

"سنا ہے شیاما سے ساہوکار کا بیٹا قتل ہو گیا ہے" اُس نے کہا۔

"آپ شاید اسی کے سلسلے میں پھر رہے ہیں؟" ——— میرا جواب سُنے بغیر اُس نے کہا ——— "اس کا قاتل کوئی رہزن ہو گا یا بدبخت نے کسی کی عورت پر ہاتھ ڈالا ہو گا۔ یہ لوگ کسانوں کو بیاج پر قرضہ دے کر اُن کی عزت بھی بیاج میں وصول کر لیتے ہیں۔"

"کیا وہ اس قماش کا آدمی تھا؟" ——— میں نے پوچھا۔

"میں تو کافر کی اولاد کو اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں اُسے اتنا ہی جانتا تھا کہ گورے رنگ کا مریل سا جوان تھا۔ لعنت بھیجو ملک صاحب! کافر جتنے بھی مر جائیں اچھا ہے۔ لکھ دو اُس کے پاس رقم تھی، کوئی ڈاکو اسے قتل کر کے رقم لے گیا ہے۔ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ گول کر دو کیس کو۔ خواہ مخواہ آپ مارے مارے پھر رہے ہیں۔"

مجھے اس جواں سال مسلمان کی باتیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ ایک تو اس کے لب و لہجے میں چاشنی اور اثر تھا، دوسرے اس کے جسم اور چہرے مُہرے کا بھی اثر تھا۔ میں نے اسے دل سے پسند کیا۔ ہم ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ کیس گول کرنا میرے لیے ممکن نہیں، لیکن تفتیش بھی آسان نظر نہیں آتی۔ میں نے اُسے واردات کا ہر ایک پہلو بتایا اور کہا کہ اپنے مزارعوں اور نوکروں سے پوچھے کہ مقتول کو کسی نے کسی طرف ٹٹو پر سوار جاتے دیکھا ہو گا۔

زاہد نے کہا کہ اُس کے مزارعے وغیرہ مقتول کو پہچانتے ہی نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد اُس نے اِدھر اُدھر کی گپ شپ شروع کر دی جو میرے لئے دلچسپ تھی۔ دماغی تھکن دُور ہو گئی اور میں تیسرے گاؤں کو چل پڑا۔ وہ تھوڑی دُور تک میرے ساتھ آیا اور اُس نے ایک بار پھر کہا کہ میں ان سُود خوروں کے بیٹے کے قتل میں زیادہ دلچسپی نہ لوں۔ اُس کے یہ الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ اُس نے کہا ——— "ان ساہوکاروں نے ان غریبوں

کو جتنا لُوٹا ہے اس کے مقابلے میں ایک ساہوکار کی موت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اُس کی جو تھیلی گم ہوئی ہے اس میں ہزاروں نہیں، تین چار سو روپے ہوں گے۔ وہ تو خود لٹیرا تھا۔ اسے کسی نے لُوٹ لیا تو کیا قیامت آگئی ہے۔"

مجھے زاہد کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ یہ خیال مجھے بھی آیا تھا کہ ان لٹیروں کے ایک بیٹے کی موت افسوسناک واقعہ نہیں مگر میں ڈیوٹی کا پابند تھا۔ مجھے قاتل کا سراغ لگانا تھا۔ میں تیسرے گاؤں میں چلا گیا۔ ہمارا استقبال مقتول کے چچا نے کیا۔ میں نے اُسے شہر میں مقتول کے گھر بھی دیکھا تھا۔ اس گاؤں سے مقتول کو صرف ایک گھر سے وصولی کرنی تھی۔ مقتول کے چچا نے بتایا کہ وہاں سے اُس نے وصولی کر لی تھی اور میرے گھر چلا گیا تھا۔

میں نے اس گھر جا کر تمام افراد کو دیکھا جہاں سے مقتول نے وصولی کی تھی۔ وہاں ایک جوان لڑکی تھی۔ میں نے اس گھر کے تمام افراد سے پُوچھا کہ مقتول نے ان کے ہاں کوئی بدتمیزی کی تھی؟ میں نے لڑکی سے بھی پوچھا۔ کسی نے بھی کوئی شکایت نہ کی۔ میں نے مقتول کے چچا سے کہا کہ شاید اُسے معلوم ہو کہ مقتول نے کبھی کسی لڑکی پر دست درازی کی ہو۔ اُس نے مقتول کی تعریفیں شروع کر دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ مقتول کے گناہوں پر پردہ ڈالے رکھے گا تو قاتل کا سُراغ نہیں ملے گا۔ بہت ساری جرح کے باوجود مجھے مقتول کے خلاف کوئی شکایت نہ ملی۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا تو بھی بات وہی رہی۔ میں دراصل اس عورت کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جس کے تین بال مقتول کی انگوٹھی میں پھنسے ہوئے تھے۔

جہاں لڑکیاں کھیلا کرتی تھیں

مقتول کے چچا نے بتایا کہ مقتول نے دوپہر کا کھانا اُس کے گھر کھایا تھا۔ اُسے ایک اور گاؤں میں بھی جانا تھا اِس لئے جلدی روانہ ہو گیا۔ میں نے پُوچھا کہ مقتول نے کوئی ایسا ذکر کیا تھا کہ کسی کے ساتھ وصولی کے سلسلے

میں اُس کا جھگڑا ہو گیا ہو؟ اُس نے بتایا کہ ایسا کوئی ذکر نہیں ہُوا تھا۔ چچا نے باتوں باتوں میں افسوس کا اظہار کیا کہ مقتول کی بہن بھی یہاں آئی ہوئی تھی۔ مقتول جب آیا تو اُس کی بہن جھیل پر گئی ہُوئی تھی۔ بے چارہ مرنے سے پہلے اپنی بہن کو بھی نہ دیکھ سکا۔ یہ وہی بہن تھی جسے میں نے مقتول کے گھر دیکھا تھا۔ معلوم ہُوا کہ بھائی کے قتل سے ایک روز پہلے گاؤں اپنے چچا کے گھر گئی تھی۔ اُس کے باپ نے مقتول سے کہا تھا کہ وصولیاں کر کے اپنی بہن کو ساتھ لیتے آنا۔ مقتول کو ابھی ایک اور گاؤں میں جانا تھا، بہن باہر گئی ہوئی تھی۔ مقتول نے چچا سے کہا تھا کہ وہ زیادہ دیر رُک نہیں سکتا۔

مقتول جس گاؤں جا رہا تھا وہاں سے ہم تفتیش کر آئے تھے وہ وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے راستے میں ہی کسی نے دھر لیا ہے۔ اس گاؤں تک ایک تو یہ راستہ تھا جس سے ہم آئے تھے۔ ایک راستہ اور بھی تھا۔ یہ جنگل اور چٹانوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ اُدھر بھی ندی پر لکڑی کا پُل تھا۔ میرے دماغ میں آئی کہ وہ اُس راستے سے گیا ہو گا۔ وہ علاقہ ویران تھا اور ڈھکا چُھپا بھی تھا۔ اُسے کوئی دیہاتن نظر آ گئی ہو گی جس پر ہاتھ ڈال کر وہ اُسی کے ہاتھوں یا اُس کے ساتھ کے کسی مرد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اگر ایسا ہی ہُوا ہے تو انہوں نے لاش اتنی دُور کیوں جا پھینکی؟ ندی میں کیوں نہ بہا دی؟

ڈاکٹر کی اس رائے کی تصدیق ہو گئی کہ مقتول کو شام سے بہت پہلے قتل کیا گیا ہے۔ اُس نے وقت دو اور چار کے درمیان بتایا تھا۔ دو بجے وقت صحیح معلوم ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے یہ تمام علاقہ کھوجنا تھا اور یہاں بہت سے مُخبر پھیلانے تھے۔

میں گاؤں میں ایک کُھلی جگہ بیٹھا تھا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سب کو پتہ چل چکا تھا کہ شیامے ساہوکار کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ اس مجمعے میں سے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ اُس نے مقتول کو باغیچے کے نیچے جھیل کے کنارے دیکھا تھا۔ میں نے اس آدمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور پوچھ گچھ کی۔

اُس نے بتایا کہ وہ ٹٹو پر سوار تھا۔ جھیل سے ذرا پرے لڑکیوں نے ایک درخت کے ساتھ جھولا ڈال رکھا تھا جسے ہم پنجابی میں پینگ کہتے ہیں۔ مقتول نے ٹٹو روک لیا تھا اور لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ آدمی اُدھر سے گزر رہا تھا۔ وہاں رُکا نہیں۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ مقتول وہاں سے کس وقت چلا اور کس طرف گیا۔

میرے کئی ایک سوال پُوچھنے پر معلوم ہُوا کہ اس گاؤں کی لڑکیاں کبھی کبھی رسّے لے کر اس خوبصورت جگہ چلی جاتی ہیں جس کے قریب ندی بہتی ہے اور اوپر چلے جاؤ تو زاہد کا باغیچہ ہے۔ وہاں وہ پینگ باندھ کر جھولا کرتی تھیں۔ مقتول کی بہن اس گاؤں میں اپنے چچا کے گھر آئی تو چچا کی بیٹی اور گاؤں کی سات آٹھ ہندو لڑکیوں کے ساتھ وہ اس جگہ چلی گئی تھی۔

مقتول کے چچا نے کہا تھا کہ مقتول جب اُس کے گھر آیا تو اُس کی بہن سہیلیوں کے ساتھ باغیچے کے نیچے چلی گئی تھی۔ مجھے جب اس آدمی نے بتایا کہ اُس نے مقتول کو اس جگہ کے قریب کھڑے دیکھا تھا تو مجھے خیال آیا کہ مقتول نے اپنی بہن کو وہاں دیکھا ہو گا اور اُسے ضرور ملا ہو گا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے مقتول کے گھر اس لڑکی کے ساتھ باتیں کی تھیں تو اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے بھائی ملا تھا۔ اگر وہ اُسے ملا ہوتا تو وہ ضرور ذکر کرتی۔

اس لڑکی کا نام شانتی تھا۔ اس کے متعلق آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نے گھر میں اس کے انداز میں بے رُخی اور لاپرواہی دیکھی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا جیسے اُسے بھائی کے مرنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا ایک بہن کو ہونا چاہیئے۔ یہ بھی اُس کی لاپرواہی یا بے تعلقی کا ثبوت تھا کہ اُس نے بھائی کو دیکھا اور پُوچھ گچھ کے دوران مجھے نہ بتایا کہ اُس نے آخری بار بھائی کو شہر سے دُور فلاں جگہ دیکھا تھا۔ بہرحال میں نے اسے اہمیت نہ دی کہ شانتی نے مجھے کیوں نہ بتایا۔ ہو سکتا ہے یہ غم کی شدت ہو جسے میں بے رُخی اور لاپرواہی سمجھ رہا تھا۔

مجھے تفتیش کی ایک اور سیڑھی مل گئی۔ میں نے اُن تمام لڑکیوں سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا جو شانتی کے ساتھ گئی تھیں۔ اُن سے یہ پتہ چل سکتا تھا کہ مقتول وہاں سے کس طرف گیا تھا اور کیا وہ اپنی بہن شانتی سے ملا تھا؟ میں نے مقتول کے چچا سے کہا کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو اپنے گھر بُلا لے۔ میں اس دوران لوگوں کو وہاں سے ہٹا کر نمبردار اور چوکیدار کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ ان کے کرنے کا ایک کام تو یہ تھا کہ وہ ٹٹو کا سراغ لگائیں۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ لڑکیاں آگئی ہیں۔ میں ایک کمرے میں بیٹھ گیا اور ایک لڑکی کو بلایا۔ میں ہر ایک سے الگ الگ تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کی باتوں سے، میرے سوالوں اور جرح سے یہ معلوم ہُوا کہ شانتی آٹھ دس روز بعد گاؤں آیا کرتی تھی۔ اُسے باغیچے کے نیچے والی جگہ اتنی پسند تھی کہ لڑکیوں کو ساتھ لے کر وہاں جایا کرتی۔ لڑکیاں بھی سیر سپاٹے کی شوقین تھیں۔ وہاں جا کر پینگ ڈالتیں اور آنکھ مچولی بھی کھیلا کرتی تھیں۔ جھیل کا ایک کنارہ اوٹ میں تھا۔ وہاں نہایا بھی کرتی تھیں۔

شانتی باغیچے میں

اس لڑکی نے مقتول کو وہاں دیکھا تھا۔ وہ پہلے ذرا پرے کھڑا رہا۔ ایک لڑکی نے کہا کہ شانتی کا بھائی کھڑا ہے۔ اُس وقت لڑکیاں پینگ جھول رہی تھیں۔ مقتول ان کے پاس چلا گیا اور شانتی کے متعلق پوچھا۔ اُس وقت لڑکیوں کو پتہ چلا کہ شانتی ان میں نہیں ہے۔

یہ کوئی عجیب بات یا گھبرانے والی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات ایک دو لڑکیاں کہیں گھومنے پھرنے یا نہانے کے لئے اِدھر اُدھر ہو جایا کرتی تھیں۔ وہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔

مقتول کو اپنے درمیان دیکھ کر سب لڑکیاں اُس کے گرد کھڑی ہو گئیں۔ ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ شانتی کہاں ہے۔ کسی کو معلوم

نہ تھا۔ ان لڑکیوں کے گاؤں کی ایک غریب سی لڑکی ذرا اوپر کھڑی تھی۔ وہ شانتی کو بھی جانتی تھی اور اُس کے بھائی کو بھی۔ وہ لڑکیوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ لڑکیاں جب مقتول کے گرد اکٹھی ہو گئیں تو یہ لڑکی بھی نیچے آگئی۔ اُس سے لڑکیوں نے کہا کہ جھیل کی طرف جا کر شانتی کو دیکھے اور اُسے بتائے کہ اُس کا بھائی آیا ہے۔

لڑکی نے جواب دیا کہ شانتی جھیل کی طرف نہیں گئی، اُوپر باغیچے کی طرف گئی ہے۔ اُس نے شانتی کو باغیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مقتول نے کہا کہ رہنے دو۔ میں خود اوپر جا کر دیکھ لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اُوپر چلا گیا۔ وہ ٹٹو پر سوار تھا۔ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول اُوپر گیا اور وہاں سے کدھر نکل گیا۔ اس کا جواب تو شانتی ہی دے سکتی تھی۔ وہ شہر میں تھی۔ میں نے تمام لڑکیوں سے ایک بار پھر پوچھ گچھ کر لینا ضروری سمجھا۔ تمام لڑکیوں کو باری باری بُلایا۔ سب کا بیان وہی تھا جو پہلی لڑکی کا تھا۔

میں نے لڑکیوں سے کہہ کر اس لڑکی کو بُلا لیا جس نے شانتی کو اُوپر جاتے دیکھا تھا۔ یہ ایک غریب سے کسان کی سیدھی سادی سی بیٹی تھی۔

میرے سامنے آئی تو اُس کے چہرے پر خوف تھا۔ اُس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ میں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکارا اور تسلّی دلاسہ دے کر اُس کا خوف کم کر دیا۔ اس ڈری ہُوئی سیدھی سادی لڑکی نے مجھے کسی اور ہی راستے پر ڈال دیا۔ اُس نے نیچے آکر جب یہ بتایا کہ شانتی اوپر باغیچے میں گئی ہے تو مقتول اُوپر چلا گیا تھا۔ یہ لڑکی بھی اُوپر چلی گئی تھی اور اُس نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ مقتول کہاں گیا ہے۔

لڑکی نے بتایا کہ وہ اُوپر کھڑی تھی۔ اُس نے شانتی کو اُوپر جاتے دیکھا۔ شانتی ایسے راستے سے جا رہی تھی جہاں وہ لڑکیوں کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ اوپر جا کر شانتی باغیچے کی طرف گئی۔ لڑکی اُسے شک کی نظروں سے نہیں بلکہ شہری لڑکی سمجھ کر اشتیاق سے دیکھتی رہی۔ شانتی کے کپڑے بھی خوبصورت تھے۔ وہ خود بھی خوبصورت تھی اور اُس کا رنگ بھی گورا تھا۔

اس لڑکی نے کہا کہ شانتی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ آگے پودوں کی باڑ تھی۔ شانتی اس میں سے آگے نکل گئی۔ کہیں سے زاہد (جاگیردار کا بیٹا) نکلا۔ اس کمسن لڑکی نے دونوں کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا اور دونوں مکان کے اندر چلے گئے۔ لڑکی نے یہ بھی دیکھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ لڑکی ذرا نیچے چلی گئی اور ان لڑکیوں کو دیکھنے لگی جو پینگ جھول رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ندی کے کنارے کنارے اُسے مقتول آتا نظر آیا۔ وہ لڑکیوں سے ذرا دُور رُک گیا۔ وہ ٹٹو پر سوار تھا۔ ذرا وقفے کے بعد وہ لڑکیوں کے پاس چلا گیا۔ لڑکیاں اس کے گرد جمع ہوگئیں۔

یہ لڑکی بھی نیچے چلی گئی۔ وہ تماشہ دیکھنے گئی تھی کہ لڑکیاں اس طرح شانتی کے بھائی کے گرد کیوں جمع ہوگئی ہیں۔ قریب جا کر اُسے پتہ چلا کہ وہ اپنی بہن کے متعلق پُوچھ رہا ہے۔ لڑکی نے اُسے یہ تو بتا دیا کہ شانتی اُوپر گئی ہے، لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ جاگیردار کے بیٹے کے ساتھ اُس کے مکان کے اندر چلی گئی ہے۔ نہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ شانتی کا بھائی بُرا منائے گا۔

مقتول ٹٹو پر سوار اُوپر چلا گیا۔ یہ لڑکی بھی اُوپر چلی گئی۔ اُسے شانتی اور اُس کے بھائی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اُوپر اِس لیے گئی تھی کہ اُس کی گائے اوپر چر رہی تھی۔ اوپر جا کر اُس نے دیکھا کہ دوسری طرف سے شانتی کا بھائی بھی اُوپر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کو دیکھ لیا اور اُسے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ اُس نے شانتی کو کس طرف جاتے دیکھا تھا۔ لڑکی نے بتانا مناسب نہ سمجھا۔ مقتول نے اُسے ڈانٹ کر پوچھا تو لڑکی نے سر سے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

مقتول شاید سمجھ گیا تھا۔ وہ مکان کی طرف گیا۔ لڑکی دُور کھڑی دیکھتی رہی۔ مقتول مکان کے قریب جا کر ٹٹو سے اُترا اور مکان کے برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں سے آگے وہ لڑکی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ

شاید مکان کے اندر چلا گیا تھا۔

لڑکی نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اُوپر ہی اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ میرے پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ ٹٹو باہر کھڑا رہا۔ بہت دیر بعد شانتی اندر سے نکلی اور بہت تیز تیز چلتی نیچے چلی گئی۔ اس کے ذرا دیر بعد زاہد باہر نکلا۔ اُس نے اپنے ایک مزارعہ یا نوکر کو آواز دی۔ لڑکی نے مجھے وہ نام بھی بتایا تھا جو زاہد نے پُکارا تھا۔ وہ نوکر دوڑتا ہُوا زاہد کے پاس گیا۔ زاہد نے اُسے کچھ کہا۔ وہ آدمی زاہد کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ پھر وہ باہر آیا اور ٹٹو کو پکڑ کر ایک اور طرف سے ندی کی طرف نیچے کو جانے لگا۔ ڈھلان اُتر کر وہ ٹٹو پر سوار ہُوا اور درختوں کی اوٹ میں کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد لڑکی نے نیچے کی طرف جا کر دیکھا، شانتی لڑکیوں کے پاس چلی گئی تھی۔ دو لڑکیاں پینگ کے رسّے کھولنے کے لیے درخت پر چڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے رسّے کھول دیئے۔ پھر اس کمسن لڑکی نے سب لڑکیوں کو گاؤں کی طرف جاتے دیکھا۔

”تم وہاں کتنی دیر رہیں؟“ —— میں نے پوچھا۔

”لڑکیوں کے چلے جانے کے بہت بعد تک میں وہیں رہی“۔ اُس نے جواب دیا۔

”تم نے ٹٹو واپس آتے دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

”شانتی کے بھائی کو مکان سے نکلتے دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

”تم اُس آدمی کو پہچان سکتی ہو جسے جاگیردار کے بیٹے نے بلایا اور جو ٹٹو لے گیا تھا؟“

”ہاں ہاں“ —— لڑکی نے جواب دیا —— ”میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”وہاں کوئی اور بھی تھا جس نے شانتی، اُس کے بھائی اور اُس

نوکر کو اندر جاتے دیکھا ہو؟"

"تین آدمی رہٹ کے قریب کچھ کام کر رہے تھے" ___ لڑکی نے جواب دیا ___ "انہوں نے ضرور دیکھا ہوگا۔"

"تم انہیں پہچانتی ہو؟"

"بہت اچھی طرح" ___ لڑکی نے جواب دیا ___ "میں ہر روز وہاں جاتی ہوں۔"

شانتی گھبرائی ہوئی تھی

میری تفتیش کا راستہ ہی بدل گیا۔ اگر یہ لڑکی سچ بول رہی تھی تو اصل قصّہ یہ ہو سکتا تھا کہ شانتی اور زاہد کی دوستی تھی۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے اندر گئے تھے اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ یہ اُن کی پہلی ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ مقتول نے لڑکی سے ڈانٹ کر پوچھا تھا کہ شانتی کہاں گئی ہے۔ وہ مکان کے اندر چلا گیا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ غصّے میں اندر گیا تھا۔ اس کی غیر شادی شدہ بہن کا ایک غیر مرد کے ساتھ اور وہ بھی ایک مسلمان کے ساتھ مکان کے اندر جانا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کچھ دیر بعد شانتی تیز چلتی باہر آئی اور اس کے بھائی کا ٹٹو کوئی اور لے گیا۔

میرے سامنے یہ بھیانک سوال آگیا ___ "کیا شانتی کے بھائی کو زاہد نے قتل کر دیا ہے اور اس کا ٹٹو اپنے نوکر کے ہاتھوں غائب کرایا ہے؟ کیا مقتول کی انگوٹھی کے ساتھ اس کی اپنی بہن کے بال تھے؟"

ان سوالوں کے جواب مجھے صرف زاہد دے سکتا تھا۔ یہ کام میرے لیے خاصا مشکل تھا کیونکہ زاہد اُس خاندان کا فرد تھا جو انگریزوں کا منظورِ نظر تھا اور یہ جاگیردار خاندان تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ خونی ڈرامہ اس

مکان میں کھیلا گیا ہے تو میری ٹکّر بڑی سخت چٹان کے ساتھ ہوگی۔ اور جب میں نے یہ تصوّر کیا کہ زاہد قاتل ہے اور وہ پھانسی چڑھ جائے گا یا عمر قید لے کر کالا پانی چلا جائے گا تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ یہ آدمی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

میرے لیے اور کوئی راستہ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے فوراً زاہد کو اور اس لڑکی کی نشاندہی پر اس کے اُس نوکر کو شاملِ تفتیش کرنا تھا جو ٹٹو لے گیا تھا اور ان نوکروں کو بھی جو اُس وقت رہٹ پر کام کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے جاگیرداروں کے نوکر اُن کے جرائم میں مددگار ہوتے ہیں اور اس کے عوض انعام حاصل کرتے ہیں۔ اُن سے کوئی بات اگلوانا آسان نہیں ہوتا۔ اگر یہ نوکر پکڑے جائیں تو جاگیردار رشوتیں دے کر انہیں چھڑا لیتے ہیں یا مقدموں کا خرچ اپنے ذمّے لے لیتے ہیں۔

میں نے زاہد پر حملہ کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ زمین پختہ کر لوں۔ میں نے لڑکیوں کو ایک بار پھر باری باری بلانا شروع کیا۔ اب میرا دماغ کسی اور رُخ پر چلا گیا تھا۔ اس میں اب یہ سوچ آگئی تھی کہ اگر مقتول زاہد کے مکان میں شانتی کے سامنے قتل ہُوا ہے تو شانتی جب وہاں سے نکل کر لڑکیوں کے پاس گئی تو اُس کی ذہنی حالت نارمل نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ لازمی تھی۔

"شانتی جب واپس آئی تو تم نے اُس سے پُوچھا تھا کہ کہاں چلی گئی تھی؟" ___ میں نے پہلی لڑکی سے پوچھا ___ "تم نے اُس سے پُوچھا ہوگا کہ اُسے بھائی ملا تھا یا نہیں۔"

"ہاں" ___ لڑکی نے جواب دیا ___ "پُوچھا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے بھائی نہیں ملا۔"

"تم نے اس سے یہ بھی پوچھا ہوگا کہ وہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟"

میرے تیر نشانے پر لگ رہے تھے۔ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "یہ بھی پوچھا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ دوڑتی آئی ہوں۔ سانس پھول گیا ہے۔"

"اُس کا سانس بہت پھولا ہُوا تھا؟"

لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی ـــــ "وہ سانس تو اتنا نہیں پھولا ہُوا تھا۔ گھبرائی ہوئی زیادہ تھی۔"

اس لڑکی سے میں نے اور بھی بہت سے سوال پوچھے اور اُسے دوسرے دروازے سے باہر جانے کو کہہ کر یہ سختی سے کہا کہ اب وہ دوسری لڑکیوں کے پاس نہ جائے۔ اس کے بعد میں نے دوسری لڑکی کو بلایا۔ اُس سے بھی میں نے کہلوا لیا کہ شانتی واپس آئی تو گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے باری باری تمام لڑکیوں سے (جو سات یا غالباً آٹھ تھیں) اپنے مطلب کی معلومات لے لیں۔

یہ ثابت ہو گیا کہ شانتی ہنسنے کھیلنے والی لڑکی تھی، مگر وہ واپس آئی تو گھبراہٹ میں تھی۔ اُس نے لڑکیوں کے پاس پہنچتے ہی کہا کہ چلو گھر چلیں۔ لڑکیاں ابھی نہیں جانا چاہتی تھیں لیکن شانتی نے رنگ میں ایسی بھنگ ڈالی کہ پینگ کے رسّے کھول دیے۔ زیادہ تر لڑکیاں ناراض ہو گئی تھیں۔ اُنہوں نے آپس میں اس قسم کی باتیں بھی کیں کہ شانتی کو بھائی نے اُوپر جا کر ڈانٹا ہے اور شاید بہن بھائی کا جھگڑا ابھی ہو گیا ہے، مگر شانتی کہتی تھی کہ اُس نے بھائی کو دیکھا ہی نہیں۔

ان لڑکیوں میں دو کچھ ہوشیار اور تیز طرار تھیں۔ اُنہوں نے میری بہت مدد کی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زاہد کے ساتھ شانتی کی پہلے سے دوستی ہے ان لڑکیوں سے سیدھا سوال کرنے کی بجائے یُوں پوچھا کہ شانتی یہاں اکثر آتی ہے اور لڑکیوں کو باغیچے کے نیچے لے جاتی ہے۔ کیا اِس سے پہلے بھی وہ اُن سے کچھ دیر کے لیے غائب ہوئی ہے؟ ـــــ میں نے یہ سوال دونوں لڑکیوں سے الگ الگ پوچھا تھا۔ ایک نے بتایا کہ وہ ہر بار اسی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ میرے

دوسرے سوال کا وہ جواب نہ دے سکی یا صحیح جواب دینا ہی نہیں چاہتی تھی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا اُس نے کبھی اُس سے پُوچھا ہے کہ وہ کہاں چلی جاتی ہے؟ ـــــ لڑکی نے صاف کہہ دیا کہ کبھی نہیں پُوچھا۔

دوسری لڑکی نے میرے دونوں سوالوں کا جواب دیا۔ اس نے بھی کہا کہ وہ ہر بار کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا ـــــ "اگر آپ میرا نام نہ لیں تو میں آپ کو سچّی بات بتا دوں..... وہ اس مسلمان کے پاس جاتی ہے۔ ہم جب کبھی شانتی کے ساتھ وہاں جاتی ہیں وہ آدمی باغیچے میں موجود ہوتا ہے، مگر ہم شانتی سے کچھ کہتی نہیں۔ ساہوکار کی بیٹی ہے۔ شہریوں کے طریقے کچھ اور ہوتے ہیں۔" لڑکی کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ اُس نے کہا۔ "مسلمانوں کے ساتھ میل جول بہت بُری بات ہے۔"

یہ ثابت ہو گیا کہ مقتول باغیچے کے مکان میں قتل ہُوا ہے اور وہاں قتل کا باعث شانتی ہے۔ انگوٹھی میں بالوں کا معمّہ یُوں حل ہوتا نظر آیا کہ مقتول نے شانتی کو زاہد کے ساتھ دیکھ کر اُسے بالوں سے پکڑا۔ زاہد نے اُسے گھسیٹا۔ مقتول کی انگوٹھی شانتی کے بالوں میں اُلجھ گئی۔ زاہد نے اُس کا گلا دبا کر مار دیا۔ اس دھینگا مشتی میں شانتی کے بال ٹوٹ کر انگوٹھی میں اُلجھے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ میں جب مقتول کے گھر گیا تھا تو شانتی نے بے رُخی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ اُسے بھائی کے مرنے کا افسوس نہیں تھا۔ مقتول نے اُس کے رنگ میں بھنگ ڈالی تھی۔

مجھے زاہد کی باتیں بھی یاد آئیں جو اُس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں اس قتل کو گول کر دوں اور لکھ دوں کہ اسے کسی رہزن یا ڈاکو نے روپوں کی تھیلی کی خاطر قتل کر دیا ہے۔ میں اُس وقت یہ سمجھ رہا تھا کہ زاہد یہ باتیں ہندوؤں کی نفرت کی وجہ سے کر رہا ہے۔ اب مجھ پر یہ واضح ہُوا کہ وہ کسی اور پس منظر میں بات کر رہا تھا۔ اس کا مقصد مجھ پر روشن ہو گیا۔

اندھیرے میں فرار اور تعاقب

سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں اتنے اہم انکشاف کے
بعد اگلی کارروائی کو اگلے روز کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے
ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبل تھے۔ مجھے انہی سے کام چلانا
تھا۔ اتنے بڑے آدمی کے بیٹے کو پکڑنے میں صورتِ حال بگڑ بھی سکتی ہے۔
یہ خطرہ بھی تھا کہ زاہد مقابلے پر اُتر آئے گا۔ اس کے پاس بندوق یا ریوالور
یا دونوں ہتھیار ہوں گے۔ میرے کانسٹیبلوں کے پاس لاٹھیاں اور دو
ہتھکڑیاں تھیں۔ صرف ایک ریوالور تھا جو میرے پاس تھا۔ مجھے یہ ڈر
بھی تھا کہ زاہد کو چونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں تفتیش کے لیے آیا ہُوا ہوں،
اس لیے وہ شہر چلا گیا ہوگا۔ وہ شہر سے بھی جا سکتا تھا۔ وہ شانتی کو بھی
اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

میں نے نمبردار، مقتول کے چچا اور چوکیدار کو کچھ ضروری باتیں سمجھائیں۔
ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو باغیچے اور مکان کے محاصرے کے لیے تیار
کیا اور اُنہیں اچھی طرح سمجھایا کہ وہ محاصرہ کس طرح تنگ کریں گے۔ کسی
کو بھاگنے نہیں دیں گے۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا بھی احساس تھا
کہ چاروں کانسٹیبل ہندو تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل مسلمان تھا اور دلیر۔ وہ
عقل والا بھی تھا۔

اپنی سکیم کے مطابق میں اکیلا باغیچے کی طرف گیا۔ اپنے آدمیوں سے
کہا تھا کہ وہ دس منٹ بعد روانہ ہوں۔ میں زاہد کے مکان کے قریب
گیا تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے دوستانہ طریقے سے ہنس کر
دُور سے ہی السلام علیکم کہا۔ وہ دوڑتا آیا۔ میں گھوڑے سے اُترا۔
زاہد نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پُوچھا کہ کوئی سُراغ ملا ہے یا نہیں۔ میں
نے مقتول اور اُس کے پیدا کرنے والوں کو دو چار گالیاں دیں۔
زاہد مجھے اندر لے گیا۔ اُس نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں کہ میں

ایک ہندو کے قتل کی تفتیش میں اتنی محنت نہ کروں۔ میں اُس کی تائید
کرتا رہا اور گپ شپ ہوتی رہی۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں کھانا اُس
کے ساتھ کھا کر جاؤں۔ میں نے سوچا کہ اس خُوبرو جوان کو گمان تک
نہیں کہ یہ آج رات میرا مہمان ہوگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ برآمدے
میں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی اور کمرے کا دروازہ زور سے کھلا۔
ہم دونوں نے دیکھا۔ وہ زاہد کا کوئی نوکر تھا۔ سخت گھبراہٹ
میں تھا۔ اُس نے کہا —— "وہ پولیس نے باہر سب کو پکڑ لیا ہے۔"
زاہد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ اتنے میں میرا ہیڈ کانسٹیبل
اندر آیا۔ اُس نے کہا —— "آٹھ آدمی ہیں ملک صاحب! یہاں اور
کوئی نہیں تھا۔"

"انہیں ایک جگہ بٹھا لو" —— میں نے اُسے کہا اور اس آدمی
کو جو اندر اطلاع دینے آیا تھا ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر کے اسے بھیج دیا۔

"یہ کیا قصہ ہے ملک صاحب؟" —— زاہد نے مجھ سے
پُوچھا۔

میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا۔ اُسے کہا —— "تم نے کہا
تھا کہ میں یہ کیس گول کر دوں لیکن تم نے اس کیس میں آ کر مجھے امتحان
میں ڈال دیا ہے۔ اگر ساری واردات خود سُنا دو تو کیس گول کرنے
کی کوشش کروں گا۔"

"میں آپ کو ساری واردات کس طرح سُنا دوں؟" اُس
نے حیرانگی سے کہا۔ "میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"زاہد بھائی! یہ واردات تمہاری ہے۔ مجھے جتنے چکّر دو
گے اتنے ہی ان چکّروں میں خود پھنسو گے" —— میں نے اُسے
دوستانہ طریقے سے اقبالِ جُرم کرنے کی نصیحت کی، مگر وہ انجان بنا
ہُوا تھا۔ میں نے پُوچھا —— "شانتی اس کمرے میں نہیں آئی تھی؟
مقتول اُس کے پیچھے نہیں آیا تھا؟ تمہارا نوکر مقتول کا ٹٹّو کہیں

لے نہیں گیا؟"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے" ـــــ اُس نے طنزیہ کہا اور بولا ـــــ "آپ کو شاید احساس نہیں کہ آپ کس پر اتنا ذلیل الزام لگا رہے ہیں۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں" ـــــ اُس کا لہجہ مہاراجوں کی طرح ہو گیا۔

"جناب کی تشریف بھی میری تشریف کے ساتھ ہی جائے گی" میں نے کہا ـــــ "زاہد! مجھے گناہگار نہ کرو۔ میں دوستوں کی طرح بات کر رہا ہوں۔ میں دوستی کا حق ادا کر کے دکھاؤں گا، لیکن تم سے حق لے کر"

"میں آپ کی باتیں سمجھ ہی نہیں سکا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "شانتی یہاں آئی تھی۔ کون شانتی؟ میں کسی شانتی کو نہیں جانتا میں نے مقتول کافر کی کبھی صورت نہیں دیکھی"

کچھ دیر ہمارے مکالمے چلتے رہے۔ وہ بولتے بولتے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس نے ایک الماری کھولی میری طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ وہ اُس وقت کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس نے الماری اس انداز سے کھولی تھی جیسے مجھے کچھ نکال کر دکھانا چاہتا ہو۔ میں اُس کی ذرا ذرا سی حرکتیں بھی دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ الماری کے اندر گیا اور میرا ہاتھ اپنے ریوالور پر گیا۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور دبے پاؤں اُس کے پیچھے ہو گیا۔ وہ جونہی گھوما میرے ریوالور کی نالی اُس کے پہلو کے ساتھ لگ چکی تھی۔ میں نے دانستہ ریوالور بائیں ہاتھ میں رکھا تھا۔ اُس کا ریوالور جو اُس نے الماری سے نکالا تھا دائیں ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس کی کلائی پر اتنی زور سے اس طرح ہاتھ مارا جس طرح قصاب ہڈی کاٹنے کے لیے چھرا مارتا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ یہ سب دو یا تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ میں نے اُسے جھکنے نہیں دیا۔ پیچھے کو مڑنے بھی نہیں دیا۔ پیچھے سے ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر گردن جکڑ لی۔ اُس کا

دم گھٹنے لگا تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ وہ توانا جوان تھا مگر اُس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آ چکی تھی جس سے وہ ہار گیا۔

میں اُسے پرے لے گیا اور چھوڑ دیا۔ اب اُس کے چہرے پر مہاراجوں والی شان اور رُعب نہیں تھا۔

"میں تمہیں گولی مار سکتا ہوں" میں نے کہا ـــــ "اب کوئی حرکت نہ کرنا۔ صرف ایک موقع دیتا ہوں۔ جُرم کا اقرار کرو گے؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

"اپنے گھوڑے پر چلنا پسند کرو گے یا پیدل چلو گے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"پولیس سٹیشن۔"

"میں نہیں جاؤں گا" ـــــ اُس نے کہا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔ وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ فوراً آ گیا۔ میں نے اُسے ہتھکڑی لانے کو کہا۔ وہ باہر نکلا تو زاہد اٹھا اور بولا ـــــ "ہتھکڑی نہ لگاؤ۔ میں اپنے گھوڑے پر ساتھ چلوں گا"

میں نے اُس کے ساتھ ہو کر اُس کے گھوڑے پر زین ڈلوائی۔ اُسے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کیا۔ اُس وقت گاؤں کا نمبردار دو آدمیوں کے ساتھ وہاں آ چکا تھا۔ میں نے مکان کی تلاشی لی۔ وہ تو چھوٹا سا ایک محل تھا۔ ایک الماری میں شراب کی بوتلیں بھی پڑی تھیں۔ مجھے وہاں واردات سے متعلق کوئی چیز نظر نہ آئی۔ زاہد کا ریوالور فرش پر پڑا تھا۔ وہ اٹھا لیا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ کچھ گولیاں الماری میں تھیں۔ مکان سے ایک دو نالی بندوق بھی برآمد ہوئی۔

تلاشی اور اس کی کاغذی کارروائی پولیس کا ایک خاص طریقہ کار ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بھی بیان کیا جائے۔ آپ کو واردات کے

ساتھ دلچسپی ہے، وہ میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں مکان پر پہرے
کا انتظام کر کے زاہد کو ساتھ لیے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کا گھوڑا
میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ میرا ہیڈ کانسٹیبل اور
کانسٹیبل نو آدمیوں کو اپنے ساتھ لا رہے تھے۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے زاہد کو ہتھکڑی لگانی چاہیئے تھی۔
اُس کا گھوڑا بڑی اچھی نسل کا تھا اور وہ تجربہ کار سوار بھی تھا۔ میرا گھوڑا
اُس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ یہ مانگا ہوا گھوڑا تھا۔ مجھے معلوم نہیں
تھا کہ دوڑنے میں کیسا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس آدمی نے مجھے
مارنے یا ڈرانے کے لیے الماری سے ریوالور نکال لیا تھا، وہ بھاگ
بھی سکتا ہے۔ زاہد دلیر تو تھا ہی۔ اُس کی اصل دلیری اپنے باپ کی
حیثیت کی وجہ سے تھی جس کی ساری عمر انگریزوں کی خوشنودی اور مٹھی چاپی
میں گزری تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زاہد نے اچانک لگام کو جھٹکا دیا۔
اُس کا گھوڑا میرے بائیں تھا۔ اُس نے گھوڑے کو بائیں طرف موڑا اور
اُس کا گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔

زاہد کو شاید یاد نہیں رہا تھا کہ میرے پاس ریوالور ہے۔ میں زاہد
پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بائیں کو موڑ
دیا۔ وہاں زمین ہموار لگتی تھی۔ میری توقع کے خلاف میرا گھوڑا بڑے
کام کا نکلا۔ اس کی دوڑ تسلی بخش تھی۔ زاہد کا مجھ سے فاصلہ بیس قدم
کے قریب ہو گا۔ میں نے ریوالور نکال کر ہوا میں ایک گولی فائر کی۔
زاہد نہیں رُکا۔ اندھیرے میں وہ مجھے سائے کی طرح نظر آتا تھا۔
میں اُس کے گھوڑے کو گولی مار سکتا تھا، مگر یہ ڈر تھا کہ گولی زاہد کو لگ
جائے گی۔ دوڑتے گھوڑے سے نشانے پر فائر کرنے کی مجھے کوئی مشق
نہیں تھی۔ زاہد اس علاقے سے واقف تھا۔ سامنے شاید کوئی رکاوٹ
ہو گی۔ اُس نے گھوڑا دائیں کو موڑا۔ میں جہاں تھا وہیں سے گھوڑا موڑ
دیا۔ اس سے فاصلہ کم ہو گیا۔ میں نے ایک اور ہوائی فائر کیا اور پھر مجھے یاد

نہیں کہ یہ کس طرح ہوا کہ زاہد کا گھوڑا کچھ ادھر مڑا، میں سیدھا جا رہا تھا۔
فاصلہ اتنا کم ہو گیا کہ پانچ چھ قدم رہ گیا۔ میں نے اُس کے گھوڑے کی
پیٹھ پر، زین کے پیچھے فائر کیا۔ اُس کا گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور
بائیں کو مڑا۔ پھر گھوڑا بے قابو ہو گیا۔

اُس کا گھوڑا زخمی ہو چکا تھا۔ میں اتنی سواری تو جانتا تھا۔ میں اس
کے پہلو میں چلا گیا اور ریوالور اُس کے گھوڑے کے کندھوں کی طرف کر
کے گولی چلا دی۔ فاصلہ تین گز سے کم ہی ہو گا۔ دو گولیاں جسم میں لے
کر گھوڑا کہاں جاتا؟ —— تھوڑی ہی دُور جا کر رُک گیا۔ زاہد
کود کر اُترا۔ میں بھی اترا۔ گھوڑا گر پڑا۔

"اگر اب بھاگے تو تمہیں بھی گولی مار دوں گا" —— میں نے اُسے کہا۔
اُسے اپنے گھوڑے کے قریب لے جا کر اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے
کیے اور گھوڑے کی لگام کے ساتھ کس کر باندھ دیئے۔ پھر میں نے
اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ لوگ بہت دُور
رہ گئے تھے۔ میری آوازوں پر وہ دیر بعد مجھ تک پہنچے۔ زاہد کا گھوڑا
تڑپ رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے ہتھکڑی لے کر زاہد کو لگا دی۔
دو کانسٹیبلوں کو زاہد کے گھوڑے کے پاس چھوڑا۔ یہ شہادت کے
لیے استعمال کرنا تھا۔ اگر پہرہ نہ لگاتا تو صبح تک درندے اسے صاف
کر جاتے اور زین کوئی آدمی اتار لے جاتا —— میں نے زاہد کے
آدمیوں سے کہا کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اُسے گولی مار
دی جائے گی۔ وہ ڈر گئے۔

مفلسی ایک جرم

میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تھانے پہنچے تو میں نے سب کو اپنے
دفتر میں فرش پر بٹھا دیا۔ زاہد کو اس کے نوکروں کے ساتھ بٹھایا محتاج

غنی ایک ہو گئے تو میں نے اپنے لے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ جا کر شانتی کو لے آئے۔ زاہد کے گھوڑے کے پہرے کی بدلی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کیا اور میں نہانے اور کھانا کھانے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ملزم پکڑ لیے تھے، لیکن اس سے میرا کام ختم نہیں ہُوا بلکہ مشکلات وہیں سے شروع ہوتی تھیں۔ شانتی ہندو تھی۔ اس میں مشکل یہ کہ وہ علاقہ ہندو اکثریت کا تھا۔ یہ کافر ایک ہندو لڑکی کی عزّت بچانے کے لیے مقتول کو فراموش کر سکتے تھے اور میرے کام میں رخنے ڈال سکتے تھے۔ دولت ان کے ہاتھ میں تھی، انگریز ان کے ہاتھ میں تھا۔

یہی مشکل مجھے زاہد کے باپ کی طرف سے نظر آرہی تھی۔ وہ گورنر تک پہنچنے والا آدمی تھا۔ اس لحاظ سے میں اسے بھی ہندوؤں کی قطار میں شامل کرتا تھا۔ میں مسلمان تھا اور پردیسی مسلمان۔ گویا اس کیس کا ایک سیاسی یا مذہبی پہلو بھی تھا۔ میں عدالت میں مقدمہ ہارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صرف ایک پہلو مجھے روشن نظر آتا تھا۔ وہ یہ کہ مقتول ہندو اور قاتل مسلمان تھا۔ اس پہلو کو دیکھ کر مجھے اُمید بندھتی تھی کہ ہندو مجھ پر نظر رکھیں گے کہ میں مسلمان ملزموں کی مدد تو نہیں کر رہا۔ اس کا مجھے بے حد قلق تھا، مگر مسلمان کا جُرم دیکھیں کہ اُس نے مجھے مارنے کے لیے ریوالور نکالا اور فرار کی کوشش بھی کی۔

میں کم وبیش دو گھنٹوں بعد تھانے میں گیا۔ آدھی رات ہونے کو تھی۔ شانتی الگ کمرے میں بیٹھی تھی۔ باقی ملزم میرے کمرے میں تھے۔ انہیں پانی کا گھونٹ بھی نہیں پینے دیا گیا تھا۔ میں نے شانتی کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے دفتر میں لے گیا۔ اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اُسے ملزموں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اُس نے سب کو دیکھا۔ زاہد کو بھی دیکھا۔ میں اُسے پھر دفتر سے باہر لے گیا۔

پیچھے ایک اور کمرہ تھا جس کی ویرانی اور ہیبت کے ہم تو عادی ہو چکے تھے، نئے آدمی کا وہاں دم گھٹنے لگتا تھا۔ بڑا ہی گندہ کمرہ تھا چھت

اور دیواروں کے ساتھ بہت ہی پُرانے جالے تھے۔ مجھ سے پہلے تھانیداروں نے اسے اسی طرح رہنے دیا تھا۔ میں نے بھی اس کی صفائی نہیں کرائی۔ یہ تفتیش کے لئے رکھا گیا تھا۔ اسے تھانے والے پچھلا کمرہ کہتے تھے۔ اس میں کسی ملزم کو اکیلا چھوڑ دینا ہی اذیّت ناک تھا۔ وہاں رات رات بھر ملزموں کو جسمانی اور ذہنی اذیّتیں دی جاتی تھیں۔ مجھ سے پہلے اس کمرے میں یکے بعد دیگرے دو ملزم اذیّتوں کی تاب نہ لا کر مر گئے تھے۔ میں اب شانتی جیسی خوبصورت لڑکی کو وہاں لے جا رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے ایک کانسٹیبل لالٹین اٹھائے دوڑتا آیا اور جا کر لالٹین کمرے میں رکھ دی۔

میں جب اس کمرے میں داخل ہُوا تو میری نظر اُس انسانی کھوپڑی اور ہڈیوں پر پڑی جو دو روز پہلے ایک چوکیدار کہیں سے اُٹھا لایا تھا۔ میں نے اپنے سٹاف سے کہا تھا کہ انہیں کہیں دفن کر دینا، لیکن قتل کی تفتیش میں مصروف ہونے کی وجہ سے کسی نے بھی اِدھر دھیان نہ دیا۔ کمرے میں ایک بنچ پڑا تھا۔ میں نے شانتی کو بنچ پر بٹھا دیا اور کھوپڑی اٹھا کر اُس کے سامنے زمین پر رکھ دی۔ دوسری ہڈیاں بھی ساتھ رکھ دیں۔ شانتی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اُس کا اتنا صاف ستھرا رنگ لالٹین کی روشنی کی طرح زرد ہو گیا۔

میں بالکل خاموش تھا۔ خاموشی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کے باہر ایک کانسٹیبل کھڑا کر دیا۔ میں نے اس کانسٹیبل کو اور دو اور کانسٹیبلوں کو ایک ہدایت دی۔ یہ کانسٹیبل سیاہ کالے رنگ کے اور موٹے بھدّے جسم کے تھے۔ اُنہوں نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یہ کام شروع کر دیا کہ ان میں سے ایک پچھلے کمرے میں جاتا۔ لڑکی کو گھور کر دیکھتا۔ کچھ دیر دیکھتا رہتا اور اس کے اِردگرد آہستہ آہستہ چکّر لگا کر باہر آجاتا۔ دس پندرہ منٹ بعد دُوسرا جاتا اور یہی عمل دُہرا کر آجاتا۔

میں نے اس دوران زاہد کو اپنے دفتر میں اپنے سامنے کُرسی پر

بٹھا لیا اور دوسرے افراد کو باہر بھیج دیا۔ مجھے ایک اور خیال آیا۔ اس کے مطابق میں زاہد کو ایک کانسٹیبل کے حوالے کر کے باہر نکلا۔ زاہد ابھی تک ہتھکڑی میں تھا۔

میں نے باہر اُن نو افراد سے کہا — "تم سب غریب آدمی ہو۔ اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہو۔ میں تم میں سے کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ امیروں کے گناہوں کی سزا اپنے سر نہ لو۔ مجھے صاف صاف بتا دو کہ کیا ہُوا ہے اور اپنی جانیں بچاؤ۔ جتنا جھوٹ بولو گے، اتنی ہی زیادہ سزا پاؤ گے۔ اس لڑکی نے مجھے ساری واردات سُنا دی ہے۔ تمہارا آقا بھی مان گیا ہے۔ اب تم کس کی صفائی میں بیان دو گے؟..... تم میں سے شانتی کو اور اُس کے بھائی کو مکان کے اندر جاتے کِس کِس نے دیکھا تھا؟..... فوراً بولو۔"

کسی کا یہ کہنا کہ مفلسی ایک جرم ہے سَو فیصد سچ ہے۔ ان غریب مزارعوں اور نوکروں سے یہ روپے پیسے والے لوگ جُرم کراتے تھے۔ ان سے جھوٹ بلواتے تھے۔ خود شراب پیتے اور انہیں انعام کے طور پر ذرا اچھی قسم کی روٹی دے دیتے تھے۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ مفلس لوگ اپنا دین اور دھرم برباد کرتے تھے۔ ان بدنصیبوں میں سے نو میرے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے آقا کے گناہ کے ملزم تھے۔ میں نے انہیں ہمدردی کے لہجے میں دھمکی دی تو اُن کی یہ حالت ہو گئی جیسے ان کے لیے فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ وہ آقا کی طرفداری کریں یا تھانیدار کی۔ اُن کے لیے دونوں طرف لعنت اور مصیبت تھی۔ ان میں سے ایک نے اظہار کر بھی دیا اور وہ رو پڑا۔

میں نے ان کا حوصلہ بڑھایا، نتائج سے بھی خبردار کیا تو اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ اُس نے سب سے کہا کہ داروغہ جی جو پوچھتے ہیں بتا دو۔ تین آدمیوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ میں اُنہیں الگ لے گیا اور کہا کہ تینوں اکٹھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا۔ اُن میں سے ایک نے بتانا شروع کیا۔ دوسرے دو اُسے لقمے دیتے

رہے۔ یہ تینوں مکان میں ملازم تھے۔

معلوم ہُوا کہ ایک سال گزرا شانتی پہلی بار اس مکان میں آئی تھی۔ طوفانی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اتنا تیز جھکڑ تھا کہ کئی درخت ٹوٹ گئے تھے۔ ندی میں سیلاب آ گیا تھا۔ نیچے ندی کے کنارے مقتول کے چچا کے گاؤں کی لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ زاہد شاید برآمدے میں تھا۔ اُسے اس طوفان میں ایک لڑکی کہیں نظر آئی۔ وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ تھی۔ باقی لڑکیاں بھاگ گئی تھیں۔ یہ لڑکی اُوپر آ گئی۔ زاہد دوڑتا گیا اور اُسے اپنے ساتھ مکان میں لے آیا۔ طوفان تھمنے تک لڑکی اندر رہی۔ شام ہونے کو تھی جب زاہد نے لڑکی کو گھوڑے پر بٹھایا۔ دوسرا گھوڑا نہیں تھا۔ وہ خود پیدل ساتھ گیا اور لڑکی کو گاؤں میں چھوڑ آیا۔

اس کے بعد دس پندرہ دنوں بعد گاؤں کی لڑکیاں نیچے ہنسنے کھیلنے اور پینگ جھولنے آئیں اور یہ لڑکی ان سے الگ ہو کر اُوپر آ جاتی اور زاہد کے ساتھ اندر چلی جاتی۔ وہ گھنٹہ دو گھنٹہ اندر رہتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے زاہد کو لڑکی پہلے پیغام دے دیتی تھی کہ وہ گاؤں جا رہی ہے۔ اگر زاہد شہر میں ہو تو وہ اپنے باغیچے میں چلا جاتا تھا۔ نوکروں کو پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی کون ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ زاہد نے سب کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے — یہ شانتی تھی۔

واردات کے روز شانتی آئی۔ زاہد نے ان تینوں نوکروں کو بتا دیا تھا کہ وہ آج آئے گی۔ وہ آئی اور زاہد کے پاس اندر چلی گئی۔ بہت دیر بعد ایک آدمی جو ٹٹو پر سوار تھا ندی کی طرف سے اُوپر آیا۔ اُس نے ایک دیہاتی لڑکی کے پاس رُک کر کچھ پوچھا۔ پھر وہ سیدھا مکان تک گیا اور ٹٹو سے اُتر کر اندر چلا گیا۔ معلوم نہیں اندر کیا ہُوا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ زاہد نے باہر آ کر ایک نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا تو زاہد نے اُسے کچھ کہا۔ نوکر ٹٹو لے کر چلا گیا۔ اس سے پہلے شانتی باہر نکلی اور نیچے چلی گئی تھی۔

زاہد نے ان تین میں سے دو نوکروں کو بلایا۔ وہ اندر گئے تو فرش پر وہ آدمی پڑا تھا جو ٹٹو پر سوار آیا تھا۔ زاہد نے انہیں کہا کہ یہ لاش اٹھا کر فلاں کمرے میں چھپا دو۔ سورج غروب ہونے کے بعد جب اندھیرا گہرا ہو جائے تو کہیں دور پھینک آنا۔ زاہد نے نوکروں کو ایک تھیلی دکھائی اور کہا کہ یہ تم تینوں خاموشی سے آپس میں بانٹ لینا۔ وہ نوکر جو ٹٹو لے گیا تھا اس کا بھی کسی طرح ذکر آ گیا۔ زاہد نے کہا کہ وہ نوکر اپنا حصّہ لے گیا ہے۔ یہ حصّہ ٹٹو کی صورت میں تھا۔ وہ نوکر کسی دور کے گاؤں میں ٹٹو بیچنے کے لیے لے گیا تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ان تینوں نے مجھے اس کا نام اور گاؤں وغیرہ بتا دیا۔

شام اندھیری ہو گئی تو یہ تینوں نوکر مقتول کی لاش کو زاہد کے گھوڑے پر ڈال کر چل پڑے اور وہاں جا پھینکی جہاں سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ باغیچے تک ابھی واپس نہیں پہنچے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ان تینوں نے مقتول کی رقم آپس میں بانٹ لی تھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ مقتول کو کس طرح قتل کیا گیا، کب قتل کیا گیا اور کس نے کیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق اندر کوئی اور نوکر نہیں تھا۔ قتل زاہد نے خود کیا ہوگا۔

اس بیان کے بعد انہوں نے اپنی مجبوریوں اور غربت کی داستان سنانی شروع کر دی۔ وہ التجائیں کر رہے تھے کہ انہیں غریب اور مجبور سمجھ کر بخش دیا جائے۔ انہوں نے اس خطرے کا اظہار بھی کیا کہ زاہد کا باپ انہیں بیان دینے کی بڑی سخت سزا دے گا۔ میں نے انہیں تسلی دلاسہ دیا اور وعدہ کیا کہ پولیس ان کی حفاظت کرے گی۔

میں نے دوسرے نوکروں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان سے ان تین افراد کے بیانوں کے بعض حصّوں کی تصدیق ہو گئی۔ کچھ ضروری نکتے میری جرح اور سوال در سوال سے واضح ہو گئے اور زاہد کے خلاف تمام شکوک یقین میں بدل گئے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے نہ کسی کو

اونگھنے دیا نہ خود اونگھنے کی سوچی۔ لوہا لال سرخ تھا، میں فوراً اسے ضرب لگا کر اپنے مطلب کی شکل دینا چاہتا تھا۔ یہ غریب بھوکے تھے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ جہاں سے بھی اور جس طرح بھی ہو ان کے لیے کھانے اور چائے کا انتظام کر دو۔

میں اپنے دفتر میں گیا۔ زاہد کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ زاہد سونے لگتا تھا تو کانسٹیبل زنجیر کو جھٹکا دے کر اسے جگا دیتا تھا۔ وہ صرف جوان ہی نہیں شہزادہ بھی تھا۔ یہ اذیت اور ذلت اس کے کبھی تصور میں بھی نہ آئی ہو گی۔ میں نے ہتھکڑی کھلوا دی اور کانسٹیبل کو باہر نکال دیا۔ زاہد جیسے مر ہی گیا تھا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا۔

"زاہد بھائی!" ـــــ میں نے اسے کہا ـــــ "اب تم کچھ نہ کہو تو بھی میری تفتیش مکمل ہو چکی ہے۔ تم نے ایک ہندو لڑکی پر بھروسہ کیا۔ اس نے ذرا سی بھی دیر نہیں لگائی۔ سب کچھ اگل دیا ہے۔"

"اس نے کیا کہا ہے؟" ـــــ اس نے پوچھا۔

"جو تم کرتے رہے ہو اور جو تم نے کیا اس نے بتا دیا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کیا تم ایک بہن سے توقع رکھ سکتے ہو کہ وہ اپنے سگے بھائی کے قتل پر پردہ ڈالے رکھے گی؟ اور تم نے ان نوکروں چاکروں پر بھروسہ کیے رکھا؟ تم دل کو یہ تسلی دیئے بیٹھے ہو کہ تمہارا وہ آدمی ہمیں نہیں مل سکے گا جو مقتول کا ٹٹو لے گیا ہے" ـــــ میں نے اس کا نام اور اس کا گاؤں اسے بتایا اور کہا ـــــ "وہ کل یہاں ٹٹو سمیت آ جائے گا ...... تم نے مجھ پر گولی چلانے کے لیے ریوالور نکالا اور حراست سے بھاگنے کی کوشش کی۔ اگر تم اقبالِ جرم کر لو تو میں تمہارے باقی دو جرم مقدمے میں شامل نہیں کروں گا۔"

وہ ضد کر رہا تھا کہ میں اسے پہلے یہ بتاؤں کہ شانتی نے کیا بیان دیا ہے۔ میں اسے بتا نہیں رہا تھا۔ بتاتا کیا؟ شانتی کے ساتھ تو

ابھی میری بات ہی نہیں ہوئی تھی۔
"سنو ملک صاحب!" —— اُس نے کہا۔ "آپ معمولی سے تھانیدار ہیں۔ داروغہ کی حیثیت ہم جانتے ہیں کیا ہوتی ہے۔ آپ جیسے چار داروغے مل کر ساری عمر اتنا نہیں کما سکتے جتنا میں آپ کو ایک منٹ میں دے دُوں گا۔ اگر آپ رقم کو ہاتھ میں لینے سے ڈرتے ہیں تو مجھے اپنے گھر کا پتہ بتائیں، رقم وہاں پہنچ جائے گی۔"

"اگر اس سے دُگنی رقم میرے آگے رکھ دو تو بھی تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے" —— میں نے کہا —— "تمہیں مسلمان سمجھ کر تمہارے ساتھ دوستانہ باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے اب تمہارے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔"

"اتنا نیک بننے کی کوشش نہ کرو ملک صاحب!" —— اُس نے جاگیرداروں کی طرح کہا —— "آپ جیسے تھانیدار میرے دروازے پر آ کر بیٹھا کرتے ہیں۔ بتاؤ، کیا لیتے ہو؟ صبح پوری رقم مل جائے گی۔ لکھ دو مقتول کو رہزنوں نے قتل کیا ہے۔"

"میں رہزن کہاں سے لاؤں گا؟" —— میں نے پوچھا —— "صرف لکھ دینے سے میرا کام ختم نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ قاتل مانگے گی۔"

اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا —— "رہزن میں دوں گا۔ آپ ڈھیلا سا مقدمہ بنا لینا۔ بَری ہم کرا لیں گے۔ آپ کا فرض پُورا ہو جائے گا۔"

میں نے کانسٹیبل کو بُلا کر کہا —— "اسے بند کر دو۔" —— کانسٹیبل اُسے اٹھانے لگا تو اُس نے کہا —— "ملک صاحب! آپ پچھتائیں گے۔ پہاڑوں سے ٹکر نہ لو۔ اپنی قسمت اپنے ہاتھوں برباد نہ کرو۔ اتنی رقم دوں گا جو آپ کا خاندان آرام سے ساری عمر کھاتا رہے گا، ورنہ آپ کا خاندان ساری عمر پُوچھتا رہے گا کہ ملک احمد یار خان کہاں ہے۔"

میرے اشارے پر کانسٹیبل اُسے گھسیٹ کر لے گیا اور حوالات میں بند کر دیا۔

کھوپڑی نے کام کر دیا

میں پچھلے کمرے میں گیا تو شانتی بنچ پر اس طرح بیٹھی تھی کہ اُس کے پاؤں بنچ پر تھے۔ اُس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اُس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ اس بھیانک کمرے نے، کھوپڑی اور ہڈیوں نے اور دو کانسٹیبلوں نے باری باری اندر جا کر اور اُسے صرف گھُور گھُور کر اُس کے اعصاب توڑ ڈالے تھے۔ ان حالات میں نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ خوفناک راز جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اسے زہریلے سانپ کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھی اور میرے پاؤں میں گر پڑی۔ اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے، پھر میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر سر میرے ایک گھٹنے کے ساتھ لگا کر کچھ کہے بغیر کانپنے لگی۔ میں نے اُسے اٹھایا۔ "مجھے یہاں سے نکالو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔" اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "مجھے پھانسی دے دو۔"

میں نے اُسے بنچ پر بٹھا دیا اور اُس کے پاس بیٹھ کر پوچھا —— "تمہارے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"پہلے یہاں سے نکالو" —— اُس نے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ کر کہا —— "میں جھُوٹ نہیں بولوں گی۔"

"پہلے بتاؤ تمہارے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟" —— میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"میں نے" —— اُس نے خوفزدہ لہجے میں کانپتی ہُوئی آواز

میں کہا ——— "اپنے بھائی کو میں نے قتل کیا ہے۔"

میرے لیے یہ جواب قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہ لڑکی اتنی دلیر نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی کو قتل کر دے، اور وہ بھی اپنے بھائی کو۔ وہ زاہد کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ محبت کی شدت تھی۔

"تم اپنا وعدہ پورا نہیں کر رہی، میں اپنا وعدہ پورا نہیں کروں گا" ——— میں نے اُسے کہا۔ "جھوٹ بولتی رہو اور اسی کمرے میں پڑی رہو۔ دیکھ لو تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ کہہ دو تمہارے بھائی کو زاہد نے قتل کیا ہے۔"

وہ اپنے مذہب کی جسقدر قسمیں کھا سکتی تھی، اُس نے کھائیں۔ میں نے آخر یہ سوچا کہ اُس کی بات سُن لوں۔ باہر مسجدوں میں اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے کانسٹیبل کو اندر بلا کر کہا کہ وہ دودھ گرم کر کے اور اس میں چینی ڈال کر ایک گلاس لے آئے۔ شانتی کے دل سے خوف دُور کرنے کے لیے میں نے کچھ باتیں کیں۔ کھوپڑی اور ہڈیاں خود اُٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیں۔ یہ کرشمہ اس کھوپڑی اور ہڈیوں کا تھا۔ انہوں نے لڑکی پر اتنا خوف طاری کیا تھا کہ اُس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بات وہاں سے شروع کرے جہاں سے اُس کی دوستی زاہد سے ہوئی تھی۔

وہ بولتی گئی۔ میں سوال کرتا گیا اور جُرم کی کہانی مکمل ہو گئی۔ جب کہانی مکمل ہوئی اُس وقت صبح کے نو بجنے والے تھے۔ اس دوران مجھے اے۔ ایس۔ آئی نے آکر بتایا کہ زاہد کا باپ آیا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اُسے بٹھاؤ۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے یہ کام دیا کہ وہ ایک دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر زاہد کے اُس نوکر کے گاؤں جائے جو ٹٹو لے گیا تھا۔ میں نے اُسے اس آدمی کا نام اور گاؤں بتا کر کہا کہ اسے گرفتار کر کے ٹٹو برآمد کرے۔

شانتی کی زبان سے میں نے جو اتنی لمبی کہانی اگلوائی وہ مختصراً یوں

ہے کہ اُسے باغیچے کے نیچے ندی کے کنارے وہ جگہ بہت اچھی لگتی تھی جو جھیل کے ساتھ تھی۔ وہ کبھی کبھار چچا کے گاؤں جایا کرتی تھی۔ ایک روز لڑکیاں اُسے وہاں لے گئیں۔ وہاں پینگ ڈالی اور وہ لڑکیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے جب وہ پہلی بار وہاں گئی تھی۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ ایک ماہ بعد گاؤں جاتی اور لڑکیوں کو اُسی جگہ لے جاتی۔

ایک سال پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ اسی جگہ لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ اچانک گھٹا چھا گئی۔ فوراً ہی بہت تیز آندھی آ گئی اور اس کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی۔ اُوپر کی طرف یعنی جس طرف سے ندی آتی تھی شاید بارش پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ندی میں سیلاب آ گیا۔ آندھی اور بارش میں اتنی شدت آ گئی کہ پاؤں پر کھڑا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ سیلاب ندی سے باہر نکل آیا۔ آندھی کی چیخوں اور بجلی کی کڑک نے لڑکیوں کو ایسا خوفزدہ کیا کہ وہ چیختی چلّاتی بھاگ اٹھیں۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

شانتی بھی بھاگی، لیکن ندی کے سیلاب نے کناروں کو ڈبو کر اُس کا راستہ روک لیا۔ وہ پیچھے کو دوڑی اور اُوپر چڑھنے لگی۔ کوئی درخت ٹوٹا تو شانتی کی چیخیں نکل گئیں۔ طوفان سے تو وہ پہلے ہی ڈری ہوئی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اوپر ایک مکان ہے، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کا مکان ہے۔ مسلمانوں کو وہ اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ مسلمان ناپاک ہوتے ہیں۔ ان کے سائے سے بھی بچنا چاہیئے۔ اُسے مسلمانوں کے متعلق بڑی خوفناک کہانیاں اور عجیب و غریب وارداتیں سنائی گئی تھیں۔ وہ اُوپر جا کر ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی، مگر آندھی کی چیخیں اور بارش کے زنّاٹے اسے بے حال کر رہے تھے۔ وہ بچّوں کی طرح رونے لگی۔

اُسے اپنی طرف کوئی آتا نظر آیا۔ یہ کوئی آدمی تھا جس نے اُس کا

بازو پکڑ لیا اور کہا ——— "میرے ساتھ بھاگ کر آؤ۔"

خوف میں اُس نے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ آدمی کون ہے۔ وہ کوئی پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ آدمی اسے مکان کے اندر لے گیا، تب وہ اور زیادہ ڈری۔ وہ تو مسلمان کا گھر تھا اور اُسے پناہ دینے والا مسلمان تھا۔ یہ خوف زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا، کیونکہ ایسے طوفان سے اُسے ایسی پناہ مل گئی تھی جس کی دیواریں تھیں اور اُوپر مضبوط چھت تھی۔

یہ آدمی زاہد تھا جس نے بعد میں شانتی کو بتایا کہ وہ برآمدے میں نکلا تو اُسے ایک درخت کے ساتھ چپکی ہوئی لڑکی نظر آئی۔ وہ دوڑتا گیا اور اسے اندر لے گیا۔ زاہد وہاں اکیلا تھا۔ شانتی کے سر سے پاؤں تک پانی بہہ رہا تھا۔ زاہد نے ایک نوکر کو بُلا کر چُولہا جلانے کو کہا اور دو ریشمی چادریں شانتی کو دے کر دوسرے کمرے میں یہ کہہ کر جانے کو کہا کہ کپڑے اتار کر ایک چادر کمر سے باندھ لے اور ایک اُوپر کر لے۔

شانتی نے اُس سے پوچھا کہ گھر میں کوئی عورت ہے تو اُسے بلا لے۔ زاہد نے اُسے بتایا کہ یہاں کوئی عورت نہیں ہے اور وہ اُسی کو عورت سمجھ لے۔ شانتی کا دل ایک بار پھر خوف کی مٹھی میں آ گیا۔ اس مسلمان سے بچنا اُسے ناممکن نظر آیا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ وہاں سے بھاگ جائے لیکن طوفان نے باہر جو دہشت اور تباہی پھیلا رکھی تھی اس میں جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

زاہد نے دیکھا کہ شانتی نے چادریں تو لے لی ہیں مگر کمرے میں نہیں جاتی۔ زاہد نے اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں داخل کر دیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ شانتی نے کپڑے اتار دیئے اور چادروں سے اپنا جسم اچھی طرح ڈھک لیا۔ کمرے سے باہر آنے کی بجائے وہ اپنے بھگوان سے التجائیں کرنے لگی کہ اُس کا چچا اس کی تلاش میں آ نکلے اور اسے اس مسلمان سے بچا لے جائے، لیکن خدا کے طوفان سے بھگوان بھی ڈرتا

تھا۔ وہ اس کی مدد کو نہ آیا۔

شانتی ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ زاہد کے پاس نوکر کھڑا تھا۔ وہ چُولہا جلا آیا تھا۔ زاہد نے نوکر سے کہا کہ وہ شانتی کے کپڑے آگ پر خشک کر دے اور دودھ گرم کر لائے۔ نوکر چلا گیا تو شانتی کو زاہد نے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون سے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ شانتی نے اُسے بتایا کہ وہ شہر کی رہنے والی ہے اور فلاں گاؤں میں اپنے چچا کے گھر آئی ہوئی ہے۔ نوکر دودھ لے آیا جو شانتی نے پینے سے انکار کر دیا۔ زاہد نے اُسے ہنس کر کہا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ مسلمان کے ہاتھ سے کچھ کھانے پینے کو پاپ سمجھتی ہے لیکن اس حالت میں اُسے دودھ کی ضرورت ہے۔ زاہد کا انداز ایسا تھا کہ شانتی نے دُودھ پی لیا۔

زاہد نے کچھ ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے یہ تو ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زندہ دل آدمی ہے، لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا کہ وہ شانتی کو ایک خوبصورت اور جوان لڑکی سمجھ کر اُسے رام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے شانتی کو بال خشک کرنے کے لیے تولیہ دیا۔ اُس کی باتوں میں لطیفے زیادہ تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، شانتی کے دل سے خوف کم ہوتا گیا۔

نوکر کپڑے خشک کر کے لے آیا۔ طوفانِ باد و باراں میں ابھی کمی نہیں آئی تھی۔ ڈیڑھ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ زاہد نے اُسے کپڑے دے کر کہا کہ دوسرے کمرے میں جا کر پہن لے۔ اُس نے کمرے میں جا کر کپڑے بدل لیے اور واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ زاہد کو گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ اتنا جوان آدمی ہے اور مسلمان بھی ہے۔ اس نے اسے ابھی چھیڑا نہیں۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے مُوڈ میں معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے شانتی سے صرف یہ ذاتی سوال پُوچھا کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں۔ شانتی نے اُسے بتایا کہ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ اس سے یہ موضوع چل پڑا کہ ہندو لڑکی شادی کے فوراً بعد بیوہ ہو جائے تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ اپنی سہیلیوں کو بھی اُس سے ملنے کو منع کر دیا جاتا ہے۔ اس

بے چاری کی جوانی اور ساری زندگی اندھیر ہو جاتی ہے۔ زاہد نے ہندو نوجوان بیوہ کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ شانتی کا دل گھبرا گیا۔ اُس نے مسلمانوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق باتیں پوچھیں۔ زاہد نے اُسے ایسی تصویر دکھائی جو شانتی کو بہت پسند آئی۔

شانتی نے اُسے کہا کہ مسلمانوں کے متعلق اُسے بتایا گیا ہے کہ عورت کے معاملے میں بڑے وحشی ہوتے ہیں۔ زاہد نے اس کا شک رفع کرنے کی کوشش کی اور اُس نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ اُسے شانتی جیسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ کوئی جسمانی دلچسپی نہیں۔ شانتی زاہد کی ظاہری شکل سے تو متاثر ہو ہی گئی تھی۔ اس تاثر میں شدت اس سے پیدا ہوئی کہ زاہد نے اُسے ایسے طوفان سے بچایا تھا جس میں اس کا مر جانا یا کم از کم بیہوش ہو جانا یقینی تھا۔ اپنے گاؤں تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ زاہد کا یہ سلوک جس کی شانتی کو توقع ہی نہیں تھی، اُس پر جادو کا اثر کر رہا تھا، مگر یہ اچھا سلوک اسے کچھ پریشان بھی کرنے لگا۔ وہ زاہد کا رویّہ اور سلوک دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کر سکتی تھی کہ یہ مسلمان اس پر دست درازی نہیں کرے گا۔ زاہد نے اُسے اتنا بے تکلف کر لیا تھا کہ وہ

بول ہی پڑی۔ کہنے لگی ——— "میں مان نہیں سکتی کہ تم مجھے اسی طرح گاؤں پہنچا دو گے جس طرح باہر سے لاتے تھے" ——— شانتی نے اپنے متعلق بتایا کہ اُسے اپنی خوبصورتی پر ناز تھا اور اسے احساس تھا کہ لوگ اُسے رُک رُک کر دیکھا کرتے ہیں۔

زاہد نے اُسے جواب دینے کی بجائے یہ کہا ——— "تم دال دیاں کھانے والی لڑکی ہو۔ گوشت کھایا کرو۔ تمہارے وہم دُور ہو جائیں گے۔"

شانتی کو ہنسی آگئی۔ اُس نے کہا کہ ہندو مذہب میں گوشت کھانا حرام ہے۔ زاہد نے ہنسی مذاق اور دو چار سنجیدہ باتوں سے اُسے قائل کر لیا کہ وہ ایک بار گوشت کھا کے دیکھے۔ زاہد نے ایک روز پہلے بہت سے پرندے مارے تھے جو اُس نے روسٹ کروا کے

رکھے ہوتے تھے۔ اُس نے نوکر سے وہ گرم کروائے۔ شانتی نے اپنے بیان میں مجھے بتایا کہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے گوشت آیا تو اُس کا پسینہ نکل آیا۔ گوشت کو ہاتھ بھی لگانا پاپ تھا۔ وہ بتا نہیں سکتی تھی کہ زاہد نے اُسے کس طرح منا لیا کہ اُس نے گوشت منہ میں ڈال لیا۔ پھر وہ دو پرندے کھا گئی۔ ایسی لذّت اور ایسے ذائقے سے وہ ہمیشہ محروم رہی تھی۔ اُسے گوشت بہت ہی پسند آیا۔ اُس نے زاہد کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ پھر طوفان تھم گیا اور جب بارش بھی رُک گئی تو زاہد نے شانتی سے کہا کہ اٹھو چلیں۔ نوکر نے گھوڑا تیار کر دیا تھا جو باہر کھڑا تھا۔

شانتی کے کچھ الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اُس نے کہا — "زاہد مجھ سے پہلے باہر نکلا۔ مجھے ایسے افسوس ہُوا جیسے میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی اور یہ شخص مجھے یہاں سے زبردستی لے جا رہا ہے۔ وہ اتنا امیر جاگیردار تھا، اتنا جوان تھا، میں اُس کے ہاتھ میں مجبور تھی۔ وہ جیسی بھی بدتمیزی کرنا چاہتا کر سکتا تھا۔ میں اُس کا مقابلہ کرنے اور اپنے آپ کو اُس سے بچانے کے قابل نہیں تھی، مگر اُس نے مجھ پر کوئی اور ہی جادُو سوار کر کے مجھے کہا کہ آؤ چلیں۔ میں جب باہر نکلی تو مجھے یہ وہم ہُوا کہ گھوڑے پر بٹھا کر وہ مجھے کہیں اور لے جا رہا ہے اور میں اغوا ہو رہی ہوں۔"

ہندو کے دل میں مُسلمان کی نفرت

زاہد نے اُسے گھوڑے پر بٹھایا اور لگام پکڑ کر آگے آگے چل پڑا۔ کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ اُس کے اتنے اچھے کپڑے خراب ہو رہے تھے اور وہ خاموشی سے چلا جا رہا تھا حتّیٰ کہ گاؤں نظر آنے لگا۔ گاؤں سے کچھ دُور ہی اُس نے شانتی سے کہا کہ وہ آگے پیدل چلی جائے۔ ہندوؤں نے

دیکھ لیا تو معلوم نہیں کیسے کیسے شک کریں۔ شام ہونے کو تھی سورج ابھی بادلوں میں تھا۔ شانتی نے اُسے کہا کہ وہ کسی کو یہ نہ بتائے کہ اس نے گوشت کھایا تھا۔ اُس نے زاہد سے یہ بھی پُوچھا کہ وہ یہیں رہتا ہے یا شہر چلا جاتا ہے۔ زاہد نے اُسے جو جواب دینا تھا دیا۔ شانتی نے یہ تو اس سے پہلے ہی پُوچھ لیا تھا کہ زاہد نے شادی کی ہے یا نہیں۔ زاہد غیر شادی شدہ تھا۔ یہ ہندو دوشیزہ زاہد کے چہرے مہرے اور حسنِ سلوک کے جادو میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس جادو کو اُس کے چچا اور چچی نے اور زیادہ پختہ اور گہرا کر دیا۔ وہ اس طرح کہ وہ چچا کے گھر میں داخل ہوئی تو چچا اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اُس نے شاید ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ باہر جا کر شانتی کو تلاش کرتا۔ اُس نے لڑکیوں سے پُوچھا تھا کہ شانتی کہاں ہے۔ یہ لڑکیاں بڑی بُری حالت میں بھاگ کر گاؤں پہنچ گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک لڑکی نے بتایا تھا کہ اُس نے شانتی کو اوپر باغیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس سے اُس کے چچا اور چچی کی تسلی ہو گئی تھی کہ وہ ندی کے سیلاب میں بہ نہیں گئی۔ اب شام کو شانتی گھر میں داخل ہوئی تو چچا نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہی ہے۔ اُس نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ باغیچے کے مکان میں چلی گئی تھی۔ وہاں اُسے زاہد ملا جس نے اس کے کپڑے خشک کرائے اور بارش تھمنے تک اُسے پناہ میں رکھا ورنہ وہ طوفان کے خوف سے ہی مر جاتی۔

چچا اور چچی کے کان میں جونہی یہ الفاظ پڑے کہ لڑکی ایک مُسلمان کے پاس رہی ہے تو دونوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر "چھی چھی" کی اور ہاتھ جوڑ کر گھبراہٹ میں پُوچھا ——— "ایک ملیچھ کے پاس تم نے اتنا وقت گزارا؟ چھی چھی چھی۔ وہاں سے کچھ کھا تو نہیں لیا تھا؟ اُس کے ہاتھ سے پانی تو نہیں پی لیا تھا؟ اپنا دھرم بھرشٹ (ناپاک) کرنے کی بجائے بہتر تھا کہ تم سیلاب یا طوفان میں مر جاتیں۔ تمہارے

ماں باپ کو ہم کیا جواب دیں گے؟" ——— اس طرح سخت نفرت کا اظہار کر کے چچا گاؤں کے پنڈت کے پاس چلا گیا۔ واپس آ کر وہ شانتی کو ساتھ لے گیا۔ پنڈت نے اس سے پُوچھا کہ اُس نے مسلمان کے ہاتھ سے کچھ کھایا پیا تھا؟ شانتی نے صاف جھُوٹ بول دیا۔ کہا کہ اُس نے کچھ نہیں کھایا۔ دوسرے سوال نے شانتی کا یہ حال کر دیا کہ غصّے سے اُس کا خُون اُبلنے لگا۔ اُس نے جواب دیا کہ اس مسلمان نے اس کے جسم کو صرف اتنا ہی ہاتھ لگایا تھا کہ وہ طوفان میں ایک درخت کے ساتھ لگی کھڑی رو رہی تھی اور وہ طوفان میں دوڑتا آیا اور اُسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

پنڈت نے فیصلہ دیا کہ اسی سے لڑکی کا جسم ناپاک ہو گیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ ہندو کے دل میں مسلمان کے خلاف نفرت کتنی گہری اُتری ہوئی ہے۔ پنڈت نے اس پر گنگا کے پانی کے چھینٹے مارے۔ جنتر منتر پڑھے اور بہت کچھ کر کے شانتی کے چچا کو یقین دلایا کہ اب لڑکی پاک ہو گئی ہے۔ شانتی نے پنڈت کو بتایا کہ زاہد نے اس کے ساتھ بالکل پاک صاف سلوک کیا اور خود کیچڑ میں پیدل چلتا اُسے گھوڑے پر بٹھا کر گاؤں کے قریب چھوڑ گیا تھا۔ پنڈت نے حقارت کے لہجے میں اُسے بتایا کہ مسلمان نیک ہو سکتا ہے، لیکن وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ مانس (گوشت) کھانے والی قوم پاپی ہوتی ہے۔ پنڈت نے شانتی کے دل میں مسلمانوں کی نفرت پکّی کرنے کے لیے اسے بہت سی باتیں بتائیں اور اپنی کتاب میں سے بھی پڑھ کر کچھ سُنایا۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ شانتی کے دل میں زاہد کے خلاف تو نفرت پیدا نہ ہوئی، اپنے پنڈت اور اپنے مذہب کے خلاف حقارت سی پیدا ہو گئی۔ اُسے اس پر بھی غصّہ آ رہا تھا کہ اس کے چچا اور چچی نے اس سے پُوچھا تک نہ تھا کہ وہ کس مُصیبت میں گرفتار رہی ہے۔ چچا اُسے تلاش کرنے کے لیے گاؤں سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔

دوسرے دن وہ شہر اپنے گھر چلی گئی۔ زاہد اس کے دل اور دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے ماں باپ اور اس بھائی کو جو قتل ہو گیا تھا، طوفان کا واقعہ سُنایا اور بتایا کہ زاہد نام کے مسلمان نے اُسے پناہ میں رکھا تھا۔ ان کا ردّعمل بھی چچا اور چچی والا تھا۔ یہ سُن کر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا کہ گاؤں کے پنڈت نے ان کی لڑکی کو پاک کر دیا ہے۔ شانتی جسمانی لحاظ سے تو بالغ ہی تھی، ذہنی لحاظ سے وہ زیادہ بالغ تھی۔ اُس کے خیالوں میں انقلاب آنے لگا۔ پندرہ بیس روز بعد پھر چچا کے گاؤں گئی۔ لڑکیوں سے کہا کہ ندی پر چلیں۔ دس بارہ لڑکیاں پینگیں اور رسّے لے کر چلی گئیں۔ وہاں موقع دیکھ کر شانتی اپنی سہیلیوں کی نظریں بچا کر ادھر چلی گئی۔ اتفاق سے زاہد وہیں تھا۔ اب شانتی وہاں

اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے گئی تھی۔ اُس میں کچھ بے تابی بھی تھی اور اُس کے دل میں بہت سے شکوک بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ملاقات فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ اُس روز زاہد کے ہاں پرندے نہیں بکرے کا گوشت پکا تھا۔ شانتی نے بلاجھجک گوشت کھا لیا۔ اُس نے زاہد سے پوچھا کہ مسلمانوں کو ہندو ناپاک کیوں سمجھتے ہیں۔ زاہد نے اُسے جو سمجھ میں آیا بتایا اور کہا ——— "اگر تم مجھے ناپاک سمجھتی ہو تو میں واقعی ناپاک ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ اتنا اچھا سلوک اس لیے کیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ پناہ میں آئی ہوئی لڑکی کے ساتھ ذرا سی بدتمیزی بھی کرنا اسلام میں گناہ ہے۔ اگر گھر میں دشمن آجائے تو اسلام کا حکم ہے کہ دوست سے بڑھ کر اس کا احترام کرو۔"

اُس روز بھی زاہد نے اس پر ثابت کر دیا کہ وہ پکّا مسلمان ہے اور مسلمان ناپاک نہیں ہُوا کرتے۔ شانتی پوری طرح زاہد کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ اُس نے میرے سامنے اس کا اظہار اس طرح کیا کہ ہندو گھرانوں میں تنگ نظری اور گھٹن زیادہ تھی اسی لیے وہ گاؤں چلی جاتی اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر ندی کے کھُلے علاقے میں چلی جایا کرتی تھی۔ زاہد نے

اُس کی زنجیریں توڑ دیں۔ اُسے جذباتی سہارا دیا جس سے وہ باغی ہو گئی۔ اس ملاقات میں اُس نے زاہد کو بتا دیا کہ وہ اُسے ملنے آیا کرے گی۔ اُن کے درمیان طے ہُوا کہ چونکہ زاہد مستقل طور پر باغیچے میں نہیں رہتا اس لیے اُسے پہلے اطلاع ملنی چاہیئے کہ شانتی آ رہی ہے۔ شانتی نے اگلی ملاقات کی تاریخ اُسی روز بتا دی۔ وہ دن آیا تو شانتی وعدے کے مطابق آ گئی۔ زاہد موجود تھا۔ وہ ایک روز پہلے مُرغابیاں مار لایا تھا جو اُس نے روسٹ کروائی تھیں۔ شانتی پر گوشت کا اثر تھا یا نہیں، زاہد کی شخصیّت اور سلوک کا اثر بڑا ہی گہرا تھا۔

کیا شانتی شکیلہ تھی؟

اِس کے بعد اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ شانتی گھر میں باغی ہو گئی۔ اُسے اپنے گھر سے اور گھر کے افراد سے لگاؤ نہ رہا۔ چچا کے گاؤں کی دو لڑکیوں نے دیکھ لیا کہ وہ ہر بار اُدھر جاتی ہے۔ اُنہوں نے شانتی کو منع کیا کہ وہ مسلمان سے نہ ملا کرے۔ شانتی نے جھوٹ بولا کہ وہ صرف باغیچے کی سیر کے لیے جایا کرتی ہے۔ ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں تو شانتی کے بھائی کو بھی پتہ چل گیا کہ وہ زاہد سے ملتی ہے۔ ان کی دو ملاقاتیں شہر میں بھی ہوئی تھیں۔ بھائی نے اُسے روکا تو شانتی نے اُسے کھری کھری سُنا دیں۔ گھر میں شانتی کا رویّہ اتنا سخت ہو گیا کہ اُس کے ماں باپ دبک گئے۔ یہاں مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ ہندو لڑکیوں کو جو وہ پندرہ سال کی عمر میں بیاہ دیا کرتے تھے، شانتی کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی۔ یہ اس کی خودسَر طبیعت کا نتیجہ تھا۔ زاہد کے اثر نے اسے اتنا خودسَر کر دیا کہ اب کوئی اس کا رشتہ مانگتا ہی نہیں تھا۔ مشہور ہو گیا تھا کہ شانتی منہ پھٹ اور بدتمیز لڑکی ہے۔ اپنے بھائی (مقتول) کے ساتھ اس کی بول چال اتنی ہی رہ گئی تھی کہ کوئی مطلب

کی بات مجبوراً کرنی ہوتی تو دونوں کے درمیان 'ہوں ہاں' ہو جاتی تھی
باپ تک کو وہ پلّے نہیں باندھتی تھی۔ اُسے دراصل زاہد نے دلیر بنا دیا تھا۔

اُس کا بھائی اُسے اکثر کہا کرتا تھا کہ زاہد میں یہی خرابی نہیں کہ وہ
مسلمان ہے بلکہ وہ بدکار مسلمان ہے۔ شانتی نے یہ کبھی بھی اس کے
سامنے اقبال نہیں کیا تھا کہ وہ زاہد سے ملتی ہے .... ایک روز
شانتی چچا کے گاؤں گئی۔ اس گاؤں کی ایک غریب سی لڑکی اُسے ملی
اور اُسے الگ لے جا کر بہت روئی۔ اُس نے شانتی کو بتایا کہ اس کا
باپ شانتی کے باپ کا مقروض ہے۔ چند دن گزرے شانتی کا بھائی
اس لڑکی کے باپ سے سُود وصول کرنے گیا۔ یہ لڑکی گاؤں سے
تھوڑی دُور کھیتوں میں کچھ کر رہی تھی۔ شانتی کے بھائی نے اس پر دست
درازی کی اور یہ لالچ بھی دیا کہ وہ اس کے باپ کا بہت سارا سُود
معاف کر دے گا۔ لڑکی نے بڑی مشکل سے اس سے اپنی عزت بچائی۔
اُس نے اپنے باپ سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ وہ بہت پریشان
تھی۔ کہتی تھی کہ وہ لوگ اس کے بھائی کے مقروض ہیں۔ جب تک قرض
ادا نہیں ہوگا بھائی اسے پریشان کرتا رہے گا۔ شانتی کو بہت
غصہ آیا۔ اس کے دل میں بھائی کی نفرت بیٹھ گئی۔ اُس روز بھی
وہ زاہد کو باغیچے میں ملی تھی۔

اپنے گھر آئی تو بھائی نے ڈانٹ کر کہا کہ وہ باغیچے میں ضرور گئی ہو
گی۔ اُس نے زاہد کو بُرا بھلا کہا تو شانتی نے کہا —— "بدکار زاہد نہیں
تم ہو جس نے کھیتوں میں ایک غریب لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا" ——
اس پر گھر میں بہت ہنگامہ ہُوا۔ بھائی نے شانتی کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ وہ
دُبلا پتلا آدمی تھا۔ شانتی نے اُس پر حملہ کر دیا اور اُس کی گردن پکڑ لی۔
بھائی نے دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر کھینچے۔ شانتی نے اس
کی گردن چھوڑ دی۔ ماں باپ اور بھائی کی بیوی نے انہیں الگ کر
دیا۔ شانتی کے بھائی کی بیوی ابھی کمسن لڑکی تھی۔ خاموشی سے گھر کی

یہ بے مزگی برداشت کرتی رہتی تھی۔

اس جھگڑے کے چھ سات دن بعد شانتی چچا کے گاؤں گئی۔ اس
کے بیان کے مطابق شہر میں وہ اُداس اور گھُٹی گھُٹی رہتی تھی لیکن گاؤں
میں جا کر اُس پر ہنسنے کھیلنے اور باہر جا کر کد کڑے لگانے کا موڈ
طاری ہو جاتا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں اس کی زندہ دلی اور ہنسوڑ طبیعت
کی وجہ سے اس کے گرد جمع ہو جاتیں اور اس کی ہر بات مانتی تھیں۔
وہ حسبِ معمول لڑکیوں کو باغیچے کے نیچے والے علاقے میں لے گئی اور
جب لڑکیاں پینگ جھولنے اور جھیل میں نہانے میں مشغول ہو گئیں
تو شانتی اوپر چلی گئی۔ زاہد اس کا منتظر تھا۔ شانتی اب اپنے گھر سے
اتنی تنگ آ چکی تھی اور اپنے بھائی سے اتنی متنفر ہو چکی تھی کہ وہ اپنے
متعلق کوئی فیصلہ کرنے پر آ گئی تھی۔ اُس نے زاہد سے صاف کہہ دیا کہ
وہ اُسے مسلمان کر لے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔ زاہد نے
ذرہ بھر حیل وحجت نہ کی۔ اُس نے کہا کہ اس کا باپ مان جائے گا،
لیکن باپ کو وہ آہستہ آہستہ ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا۔ شانتی گھر
سے کسی بھی وقت بھاگ آنے کو تیار تھی۔ زاہد نے اس وعدے کے
ساتھ اُسے روک دیا کہ وہ شادی کرے گا تو اسی کے ساتھ کرے گا۔

شانتی نے زاہد سے پوچھا کہ مسلمان ہونے کا طریقہ کیا ہے۔
زاہد نے اسے بتایا تو شانتی نے کہا کہ مجھے اپنا کلمہ پڑھاؤ۔ زاہد نے اُسے
بسم اللہ پڑھائی۔ پھر کلمہ طیبّہ پڑھانا شروع کیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر
اُس نے دونوں زبانی یاد کر لیے۔ اُس نے معنی پوچھے تو زاہد نے بتا
دیئے۔ اُسے معنی بھی اچھے لگے۔ اُس نے زاہد سے کہا کہ وہ مسلمان ہو
گئی ہے اس لیے اسے اب وہ شانتی نہ کہا کرے۔ زاہد نے اُسے کہا
کہ اب وہ اسے شکیلہ کہا کرے گا۔ شانتی نے اسے کہا کہ وہ جس طرح
مسلمان ہو گئی ہے اسی طرح شادی بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے زاہد سے
پوچھا کہ مسلمانوں میں شادی کی مذہبی رسم کیا ہوتی ہے؟ آؤ وہ ہمیں پوری

کریں۔ زاہد نے جواب دیا "شادی کا معاملہ اتنا آسان اور کچا نہیں ہوتا۔ یہ مذہب کے مطابق ہوگا اور ضرور ہوگا۔"

مَیں نے شانتی سے کہا ـــــ "شادی کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو پہلے ہی میاں بیوی تھے۔"

"نہیں" شانتی نے بڑی زور سے سر ہلا کر کہا ـــــ "ہمارا میل جسموں کا کھیل نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں کلمہ نہ پڑھتی اور اپنے سگے بھائی کو قتل نہ کرتی۔ اگر زاہد بدنیت ہوتا تو میں اُس پر یُوں جان نہ دیتی۔ ہماری محبت روحوں میں اُتر گئی تھی۔ زاہد نے کہا تھا کہ باقاعدہ شادی کیے بغیر میں تمہیں کسی اور نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اُس نے مجھ سے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا اور کبھی دھوکہ نہیں دیا۔"

شانتی اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے لگی اور زاہد اُسے شکیلہ کہنے لگا۔ اس کے بعد ان کی جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں شانتی نے زاہد سے کہا ـــــ "تمہیں شرم نہیں آتی زاہد؟ ایک مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر میں رہتی ہے"۔ ـــــ زاہد نے اپنے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ شانتی کے ساتھ شادی کرے گا۔ باپ نے اسے اجازت نہیں دی تھی اور انکار بھی نہیں کیا تھا۔ زاہد اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس نے کاشتکاری اور مزارعوں وغیرہ کا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا۔ باپ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اتنی آسانی سے اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا، اس لیے شادی ملتوی ہوتی جا رہی تھی۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شانتی اسلام میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتی تھی۔ زاہد کو جو کچھ معلوم تھا وہ اُسے بتا دیتا تھا۔ اُن کی ملاقاتوں کا وقت کم اور وقفہ زیادہ ہوتا تھا، اس لیے شانتی نماز وغیرہ یاد نہ کر سکی۔

پھر وہ دن آیا جس دن شانتی کا بھائی تین گاؤں سے وصولیوں کے لیے ٹٹو پر سوار ہو کر روانہ ہُوا۔ میں پہلے سُنا چکا ہوں کہ وہ کہاں کہاں گیا تھا۔ شانتی ایک روز پہلے کی چچا کے گھر تھی۔ دوسرے دن وہ سات

آٹھ لڑکیوں کے ساتھ پینگ اور رستے لے کر ندی کے کنارے چلی گئی۔ اپنے معمول کے مطابق وہ موقعہ دیکھ کر اُوپر چلی گئی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا بھائی وصولی کے لیے چچا کے گاؤں میں آئے گا۔ معلوم ہوتا بھی تو اسے پروا نہیں تھی۔ اُسے تو وہ اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ وہ زاہد کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ زاہد مکان کی پچھلی طرف کسی نوکر کو کوئی کام بتا رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور شانتی کا بھائی اندر آیا۔ ایک سال کے عرصے میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس کے بھائی نے اُسے زاہد کے مکان میں دیکھا تھا اُس نے شانتی کو گالی دی اور تیزی سے آگے جا کر شانتی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ شانتی کے دل میں وہ ساری نفرت اُمڈ آئی جو بھائی کے خلاف بھری ہوئی تھی۔ شانتی نے غصے سے دانت پیس ڈالے اور کہا ـــــ "تم کمینے ہندو! ایک مسلمان لڑکی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کر سکتے ہو؟"

غصے اور نفرت نے اور پکڑے جانے کے احساس نے اُسے پاگل کر دیا۔ اُس نے بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ کر بھائی کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ بھائی نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے بال مٹھیوں میں لے لیے اور پوری طاقت سے بالوں کو جھٹکے دیئے۔ درد کی شدت سے شانتی کے ہاتھ بھائی کی گردن سے ڈھیلے ہونے کی بجائے اور سخت ہو گئے۔ شانتی کے بیان کے مطابق وہ بھائی

کو جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی، مگر اُس کے ہاتھوں کا شکنجہ بالوں کے درد سے بہت ہی تنگ ہو گیا۔ اتنے میں زاہد اندر آ گیا۔ اُس کی آواز سُنائی دی ـــــ "کیا ہو رہا ہے شکیلہ؟" ـــــ اُس نے دونوں کے بازو پکڑ لیے۔ وہ انہیں چھڑا رہا تھا۔ شانتی نے بھائی کی گردن چھوڑ دی لیکن بھائی نے اُس کے بال نہ چھوڑے۔ وہ گر پڑا۔ اُس کے ایک ہاتھ سے شانتی کے بال چھوٹ گئے۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی کھُل گئی لیکن اس کے بال کھچے اور پھر آزاد ہو گئے۔

شانتی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کے بھائی نے اس کے تین بال مرتے
مرتے اپنے ساتھ رکھ لیے ہیں اور یہ بال پولیس کو باغیچے تک لے
آئیں گے۔ یہی تھے وہ بال جو مقتول کی انگوٹھی میں پھنسے ہُوئے تھے۔
زاہد نے شانتی کے بھائی کو بلایا۔ اس کی نبض دیکھی اور کہا ——
"وشکا! تم نے اسے جان سے مار دیا ہے۔"
"مر گیا ہے؟"
زاہد نے اُسے بتایا کہ مر گیا ہے۔ شانتی کو چکر آ گیا۔ زاہد نے اُسے
کہا —— "کوئی پروا نہ کرو۔ مر گیا تو اچھا ہُوا۔ تم چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے
ساتھ ہنسو کھیلو۔ گھبرانا نہیں۔ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکالنا۔
میں لاش غائب کر دوں گا۔ اگر کچھ گڑبڑ ہو گئی تو کہنا مجھے کچھ پتہ نہیں۔
میں خود سنبھال لوں گا۔"
شانتی وہاں سے نکلی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ گھبراہٹ
پر قابو پا لے مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ بھائی کی لاش کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے
سامنے سے ہٹتا نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کے پاس گئی۔ اُس نے ہنسنے
کھیلنے کی کوشش کی تو دل پر گھبراہٹ اور زیادہ ہو گئی۔ اس نے لڑکیوں سے
کہا کہ گھر چلو۔ وہ ابھی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ شانتی نے غصّے میں آ
کر اُن کے رنگ میں بھنگ ڈال دی تو سب چل پڑیں۔ دو لڑکیوں
نے اُس سے پُوچھا کہ بھائی سے لڑائی جھگڑا ہو گیا ہے؟ اُس نے
جواب دیا کہ اُس نے تو بھائی کو دیکھا ہی نہیں۔ لڑکیوں نے کہا کہ
وہ ٹٹو پر سوار تھا اور پہلے پیچھے آیا تھا۔ اُس نے اُس کے متعلق پوچھا
تھا۔ پھر اُوپر چلا گیا تھا۔ شانتی نے اُنہیں بتایا کہ وہ اُوپر جا کر ایک
درخت کے نیچے لیٹ گئی تھی کیونکہ اُس کے سر میں بڑا سخت درد
تھا۔ اُس نے بھائی کو دیکھا ہی نہیں۔
گاؤں پہنچتے ہی اُس نے چچا سے کہا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی
ہے۔ چچا نے ٹٹو کا انتظام کر دیا اور ایک آدمی ساتھ کر دیا۔ گھر

آ کر اُس کی ذہنی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ گھر والوں نے دھیان نہ دیا
کیونکہ وہ گھر میں سب کے ساتھ کھچی کھچی رہتی تھی۔ دوسرے دن
اطلاع ملی کہ اُس کے بھائی کی لاش ملی ہے۔ شانتی کو جب پتہ چلا کہ لاش
باغیچے سے نہیں بلکہ کہیں اَور سے ملی ہے تو اُس کے دل کو کچھ قرار
آ گیا، مگر یہ قرار زیادہ دیر نہ رہا۔ ایک کانسٹیبل آیا اور اسے تھانے لے آیا۔
بیان دے کر شانتی نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا ——
"اب زاہد کو چھوڑ دو۔ میں نے سچ سچ بتا دیا ہے کہ اپنے بھائی کو میں
نے قتل کیا ہے۔ زاہد بے قصور ہے" —— میں نے اس سے
جھوٹا وعدہ کیا تو وہ خوش ہو گئی۔

عدالت اور محبّت

میں جب پچھلے کمرے سے نکل کر اپنے دفتر کی طرف گیا تو دفتر کے
سامنے شانتی کا باپ اور دس بارہ ہندو کھڑے تھے۔ یہ شہر کے
معزّزین تھے۔ ان سے ذرا الگ ہٹ کر زاہد کا باپ کھڑا تھا۔ مجھے
دیکھ کر سب اس طرح میری طرف آئے جیسے مجھ پر حملہ کر دیں گے۔
انہوں نے اکٹھے ہی بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک "عزّت دار"
آڑھتی اور ساہوکار کی بیٹی کو چھڑانے یا یہ ضمانت لینے آئے تھے کہ
اس لڑکی کو باعزّت طریقے سے تھانے میں رکھا جائے گا۔ زاہد
کا باپ بھی میرے پاس آیا۔ اُس نے جواب طلبی کے انداز سے حاکمانہ
لہجے میں کہا —— "سُنا ہے تم نے میرے بیٹے کو حوالات
میں بند کر رکھا ہے۔ اس پر ذرا سوچ کر ہاتھ ڈالنا۔"
شہر کا سب سے معزّز ہندو مجھے الگ لے گیا اور پُوچھنے
لگا کہ قاتل کون ہے اور میں کیا کارروائی کر رہا ہوں۔ میں نے اُسے
جواب دیا کہ اس مرحلے میں میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس ہندو نے

کہا ——— "آپ نے ہماری لڑکی کو بلا وجہ تھانے بٹھالیا ہے.... قاتل زاہد ہے۔ مجھے شک ہے کہ آپ مسلمان کی طرفداری کر رہے ہیں" ——— مجھے غصّہ تو بہت آیا لیکن میں غصّہ پی گیا۔ اُسے کہا کہ وہ میرے فرائض میں دخل اندازی نہ کرے۔ میں نے دیکھا کہ ان ہندوؤں کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔ زاہد کا باپ الگ دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے سب سے کہا کہ وہ تھانے کے احاطے سے باہر نکل جائیں ورنہ میں اپنے کانسٹیبلوں کو استعمال کروں گا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ میں نے ضلعے کو ٹیلیفون کیا اور براہِ راست ڈی۔ ایس۔ پی سے بات کی۔ اُسے کیس کی نوعیت بتائی اور ہندوؤں کا اور زاہد کے باپ کا رویّہ بتایا۔ میں نے کہا کہ کیس بالکل واضح ہے لیکن یہ ہندو مسلم چپقلش کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

انگریز اپنے قانون کا پورا احترام کرتے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے سپیشل سٹاف کا ایک انگریز انسپکٹر بھیج دیا۔ اس نے آتے ہی کیس اپنی نگرانی میں لے لیا۔ شانتی نے مجسٹریٹ کو اپنا اقبالی بیان دے دیا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی ٹوٹ برآمد کرلایا اور ٹوٹ لے جانے والے نوکر کو بھی پکڑ لایا۔ زاہد نے کوئی بیان نہ دیا۔ شانتی کو جوڈیشل لاک اَپ (جیل کی حوالات) میں بھیج دیا گیا تھا۔ لاش اٹھا کر دور پھینکنے والے نوکروں نے بھی مجسٹریٹ کو بیان قلمبند کروا دیئے۔ انہیں بھی جیل بھیج دیا گیا اور زاہد کو ایک ہفتے کے ریمانڈ کے بعد جیل کی حوالات میں بھیجا گیا۔

مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ جب میں نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ شانتی نے اقبالِ جرم کرلیا ہے جو متعلقہ مجسٹریٹ صاحب پیش کریں گے تو زاہد جو ہتھکڑیوں میں تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے چلّا کر کہا ——— "یہ جھوٹ ہے۔ شیامے ساہوکار کے بیٹے کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس لڑکی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اگر اس لڑکی نے اقبالی بیان دیا ہے تو اس تھانیدار نے اُسے ڈرا دھمکا کر بیان

لیا ہے۔"

عدالت کسی ملزم کا واویلا نہیں سُنا کرتی۔ وہاں کا طریقہ کار کچھ اور ہوتا ہے۔ زاہد کو خاموش کرا دیا گیا۔ آخر میں مجسٹریٹ نے مقدمہ سیشن کورٹ کے حوالے کر دیا۔ وہاں بھی جب شانتی کا اقبالی بیان قلمبند کرنے والا مجسٹریٹ اس کا اقبالی بیان پڑھ کر سُنا رہا تھا تو زاہد نے چلّانا شروع کر دیا ——— "یہ بیان جھوٹا ہے۔ شیامے ساہوکار کے بیٹے کو میں نے قتل کیا ہے" ——— سیشن جج انگریز تھا۔ اس نے زاہد کو خبردار کیا کہ وہ بدتمیزی دوبارہ کرے گا تو توہینِ عدالت کے جرم میں اُسے چھ ماہ سزائے قید بامشقت دی جائے گی۔ شانتی بھی اُس کے ساتھ کٹہرے میں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اُسے بازو سے پکڑ کر بٹھانے اور چُپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی...... شانتی اپنے بیان سے منحرف نہیں ہوئی۔ آخر اُسے عمر قید کی سزا دی گئی۔

زاہد کو اعانتِ جرم، مقتول کی ردلیوں کی تھیلی چوری کرنے اور لاش غائب کرنے میں پانچ سال اور لاش اٹھا کر لے جانے والوں کو دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ ٹوٹ لے جانے والے کو بری کر دیا گیا۔

زاہد کے باپ نے بعد میں مجھ سے گلہ کیا کہ میں نے اُسے بات کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مسلمان کی حیثیت سے میں جو مدد کر سکتا تھا وہ رشوت کے بغیر ہی کر دی ہے۔ میں نے زاہد کے دو جرم مقدمے میں شامل ہی نہیں کیے تھے۔ ایک اُس کا ریوالور نکالنا اور دوسرے حراست سے بھاگنا۔ زاہد کے باپ نے اور شانتی کے باپ نے بھی ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ دونوں اپیلیں مسترد ہو گئیں۔

وہ مسلمان کی اولاد تھا

سولہ سال کی عمر کا ایک ہندو لڑکا لاپتہ ہو گیا۔ تھانے میں رپورٹ دینے اُس کا باپ آیا تھا۔ یہ آدمی آڑھتی تھا۔ قصبے میں اس کی اچھی حیثیت تھی، لیکن اس کی صرف حیثیت ہی اچھی تھی باقی وہ جو کچھ بھی تھا مضحکہ خیز تھا۔ میں گمشدہ لڑکے کا حُلیہ بیان کرنے سے پہلے باپ کا حُلیہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں ورنہ اس واردات کی جو بنیاد تھی وہ ہمارے نوجوانوں کو ناقابلِ یقین لگے گی۔ ان نوجوانوں نے جدید ہندو دیکھے ہوں گے جو اُنہیں بھارت کے ٹی وی پر دکھاتے جاتے ہیں یا کہیں کوئی ایک آدھ نظر آجاتا ہے۔ اصل ہندو یا ہندو کا اصل حلیہ کچھ اور ہے۔ یہ ہندو بھارت میں اپنے اصل حُلیے میں اب بھی افراط سے پائے جاتے ہیں۔ آزادی سے پہلے میرے جن بہن بھائیوں نے ہندو دیکھے ہیں وہ اس حلیے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ ہندو باپ انہی ہندوؤں یا اصل ہندوؤں میں سے تھا۔ پیٹ دیگچے کے نیچے والے حصّے کی طرح آگے کو بڑھا ہُوا، قد چھوٹا، مونچھیں اتنی نیچے کو گری ہوئیں کہ دونوں ہونٹ یعنی پُورا مُنہ ان میں چھپا ہُوا تھا۔ ناک کے بال باہر آکر مونچھوں سے مل گئے تھے۔ سر اُسترے سے صاف کیا ہُوا۔ سر کی چوٹی پر لمبی بودی تھی جو ہندوؤں کا امتیازی نشان ہے۔ جدید ہندو نے بودی ترک کر دی ہے۔ اُس نے کرتہ پہن رکھا تھا اور نیچے دھوتی تھی جس کا اس نے ایک پلّو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے اُڑسا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ

لمبوترا اور سرپستول کے کارتوس کی طرح اُوپر کو چلا گیا تھا۔ رنگ گہرا
گندمی تھا جسے آپ سانولا کہہ سکتے ہیں۔

اللہ مجھے معاف کرے، میں اُس کی شکل وصورت اور بدصورتی
کا مذاق اڑانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ اللہ کی خوشنودی ہے، جسے
جیسا چاہے ویسا بناتے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسان میں کوئی
اور وصف ہو تو اس ہندو سے بھی بھدی اور مضحکہ خیز شکل وصورت
اور قد بُت کے آدمی بھی لوگوں کو اچھے لگتے ہیں۔ لوگوں کے دِلوں
میں محبّت پیدا کرنے کے لئے خوبصورتی کا درجہ بعد میں آتا ہے۔ اس
ہندو کی باتوں کا انداز بھی قابل نفرت تھا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے
کہ ہندو بُزدل قوم ہے۔ بُزدلی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان مکّار اور
فریب کار ہو جاتا ہے۔ یہ اوصاف ہندو میں کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوتے
ہیں۔ اگر ہندو کو آپ کے ساتھ مطلب ہے تو فی الواقع آپ کے پاؤں
میں بیٹھے گا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کے لہجے میں بات کرے گا، اور جب
وہ آپ پر وار کرے گا تو آپ کے تمام احسانات کو دل سے اُتار کر زمین
کے نیچے سے وار کرے گا۔ ہندو اگر سامنے آکر مقابلہ کرے گا تو ہجوم کی صورت
میں آئے گا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک ایک گھر پر بیسیوں
کے ہجوم کی صورت میں حملے کیے تھے۔ معصوم بچّوں کو بھی قتل کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء
میں ہندو ہجوم کی صورت میں پاکستان پر حملہ آور ہُوا تھا۔ ہماری ایک ایک
پلٹن کی پوزیشن پر دو دو بریگیڈوں نے حملے کیے تھے۔ ہجوم کی صورت آئے
ہجوم کی صورت بھاگے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر ہندو ہجوم کی صورت
میں حملہ آور ہوئے تھے۔

اگر آپ بوریت محسوس نہ کریں تو ایک دلچسپ بات سُنا دوں۔ میرے
ایک چچازاد بھائی دوسری جنگِ عظیم میں صوبیدار میجر تھے۔ اُن دنوں شمالی
افریقہ میں جنگ ہو رہی تھی۔ میرے بھائی نے سُنایا کہ وہ ایک رات کمپنیوں
کی رپورٹ لے رہے تھے۔ دو کمپنیاں مسلمانوں کی تھیں۔ ایک سکھوں

کی اور ایک ہندوؤں کی۔ مسلمان اور سکھ صُوبیداروں نے یُوں رپورٹ
دی ــــ "فلاں کمپنی اتنے جوان فلاں پوزیشن میں۔ سب اچھا"۔
ہندوؤں کی کمپنی کے ہندو صوبیدار نے رپورٹ دی ــــ "سی کمپنی
کے پچانوے جوان فلاں پوزیشن میں اکیلے ہیں"۔ ــــ ہندو پچانوے
کی تعداد میں بھی تنہائی محسوس کیا کرتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں۔ بات کہاں سے کہاں لے گیا ہوں۔ میری
مجبوری یہ ہے کہ ہندو کا ذکر آتا ہے تو خون کھولنے لگتا ہے۔ ہماری
قوم کی وہ نسلیں جو پاکستان میں پیدا ہوئی ہیں اگر تھوڑا عرصہ ہندو کے
دیس میں اُن کے ساتھ گزار آئیں تب ہی سمجھ سکیں گی کہ ہندو کیا اور کیسا ہے۔
ہندو اپنے مطلب کی خاطر اور اپنے دشمن یعنی مسلمان کو شکست دینے
کی خاطر اپنی بیٹی کی آبرو تک قربان کر دیا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ہندو
میں غیرت کا نام ونشان نہیں ملتا۔ مَیں نے بات اس لئے بھی لمبی کر دی
ہے کہ جو واردات سُنانے لگا ہوں اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے پس منظر
بیان کرنا ضروری تھا۔

میں تھانے کے برآمدے میں کھڑا تھا جب یہ ہندو تھانے کے پھاٹک
میں داخل ہُوا۔ اتنی بڑی توند اُسے چلنے نہیں دے رہی تھی۔ پاؤں گھسیٹ
رہا تھا۔ اُس کا مُنہ کھلا ہُوا تھا اور نیچے والا ہونٹ لٹکا ہُوا تھا۔ اُس کے
سر پر ململ کا بڑا سا پگڑ ڈھیلا ڈھالا بندھا ہُوا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سے
شاید کچھ کم ہی تھی۔ میرے پاس اپنا ہیڈ کانسٹیبل امجد علی کھڑا تھا۔
کہنے لگا ــــ "کوئی مسلمان اِس بنئے کی رقم ہضم کر گیا۔ کافر کی چال دیکھو
جیسے اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے..... آڑھتی ہے"۔

وہ ہم سے بیس قدم دُور ہی رُک گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ــــ
"نمستے مہاراج! آگے آجاؤں؟"

کچھ تو اُس کی شکل احمقوں والی تھی، باقی کسر چال نے پُوری کر
دی تھی۔ وہیں رُک جانے اور ہاتھ جوڑ کر آگے آنے کی اجازت

ماننگنے سے تصدیق ہوگئی کہ اندر اور باہر سے اور بال بال سے ہندو بنیا
ہے۔ نوسربازی، مکاری اور بزدلی بڑے موٹے حروف میں اس کے
چہرے پر لکھی تھی۔ آدمی پیسے والا تھا اور ہندو کو صرف پیسے سے پیار ہوتا
ہے۔ میں نے کہا ـــــ "آئیے لالہ جی، آئیے۔ خیریت تو ہے؟"
برآمدے کی تین سیڑھیاں تھیں۔ مجھے وہ منظر آج تک یاد ہے۔
اُس نے پہلی ہی سیڑھی سے ٹھوکر کھائی اور ایک ہاتھ اوپر والی سیڑھی
پر رکھ کر اپنے آپ کو گرنے سے اور دوسرا ہاتھ پگڑ پر رکھ کر پگڑ کو گرنے
سے بچایا۔ اگر آپ نے سرکس یا تھیٹر کے جوکر دیکھے ہیں تو آپ سمجھ سکیں گے
کہ وہ کس طرح کھسیانہ ہو کر ہنسا تھا۔ سیدھا ہو کر اُوپر آیا اور ہاتھ جوڑ
کر بولا ـــــ "مہاراج جی! میرا لڑکا گم ہوگیا ہے۔"
"کتنا بڑا تھا لالہ جی؟"
"پندرہ سولہ برس کا۔"
"میں سمجھا کوئی چھوٹا سا بچّہ ہوگا" میں نے کہا ـــــ "لالہ جی! جوان
لڑکا ہے۔ دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا ہوگا۔ اتنے بڑے لڑکے
کو کسی نے اغوا تھوڑے ہی کیا ہوگا۔"
"اس کی ماں بہت پریشان ہے" اُس نے کہا ـــــ "نہ
گھر میں بیٹھنے دیتی ہے نہ دکان پر۔ میں نے بھی یہی کہا تھا کہ
خود ہی کہیں نکل گیا ہوگا، لیکن وہ میری سنتی ہی نہیں۔ کہتی ہے
تھانے میں رپٹ درج کراؤ اور میرا بیٹا ڈھونڈ کے لاؤ۔"

لڑکا خوبصورت اور قیمتی تھا

اگر لاپتہ ہونے والا بچّہ ہوتا تو میں فوراً کارروائی شروع کر دیتا۔
یہ بچّہ نہیں تھا۔ تھانیدار عموماً اس قسم کی رپورٹیں درج کرنے سے گریز
کرتے ہیں۔ جوان لڑکے اِدھر اُدھر ہو جاتے اور واپس آجاتے ہیں۔
میں نے بھی اسی انداز سے اس کے ساتھ بات کی، لیکن وہ رپورٹ

درج کرانے پر زور دے رہا تھا۔ میں آپ کو دو تین کہانیاں سُنا چکا ہوں
جن سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔
میری ان کے ساتھ ٹکر ہو چکی تھی۔ میں انہیں ذلیل کر چکا تھا، اس لئے
میں اُن کے انتقامی حملے سے چوکنّا رہتا تھا۔ اس بنا پر میں نے رپورٹ
درج کرنی مناسب سمجھی اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ لڑکے کے
متعلق اس سے جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھیں کہ اُسے لاپتہ ہوئے
یہ تیسرا دن تھا۔ لڑکے کا حلیہ یہ بتایا کہ بہت خوبصورت تھا۔ رنگ گورا،
آنکھیں بڑی اور جنہیں شاعر شربتی کہا کرتے ہیں۔ گردن لمبی، جسم دُبلا۔ میرے
کریدنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کا قد بُت اور خوبصورتی لڑکیوں جیسی تھی
خوبصورتی کا یہ معیار میرے لئے حیران کُن تھا۔ اس ہونق کا بیٹا
اتنا خوبصورت نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے خوبصورتی کی جو تفصیل بتائی
اس سے مجھے شک ہُوا کہ لڑکے کے اغوا کا امکان موجود ہے۔ یہ
بھی پتہ چلا کہ اُس کی آواز سُریلی تھی اور بہت اچھا گاتا تھا۔ اس کا
مطلب یہ تھا کہ لڑکا قیمتی تھا۔ میں نے آپ کو ایک واردات سُنائی
تھی جس میں مجھے پتہ چلا تھا کہ ایک دو مہاراجے اس قسم کے خوبصورت
لڑکوں کو ناچ گانے کے لئے خرید لیتے اور اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس
لڑکے کی گمشدگی بھی مجھے ایسی ہی واردات معلوم ہونے لگی۔ مجھے بردہ فروش
ڈاکوؤں کا بھی خیال آیا۔ میرے علاقے میں ایسے دو پیشہ ور موجود تھے
اور مجھے اس علاقے کے ایک مسلمان پیر کا بھی خیال آیا جو رنگین مزاج
تھا۔ بہر حال ابھی میں ابتدائی رپورٹ لے رہا تھا اور غالب شک یہ
تھا کہ لڑکا دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکل گیا ہے۔
"پہلے کبھی گھر سے اس طرح غائب ہُوا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اس طرح غائب تو کبھی نہیں ہُوا تھا۔۔۔ لیکن" ـــــ وہ جھجک گیا۔
میں نے 'لیکن' پر زور دے کر کہا کہ وہ میرے ساتھ بات کھُل کر کرے
ورنہ لڑکے کی تلاش محال ہو جائے گی۔ اُس نے کہا ـــــ "غائب تو

نہیں ہُوا، یوں سمجھ لیں کہ غائب ہی رہتا تھا.... دکان پر نہیں بیٹھتا تھا۔"

"آپ نے اُسے سکول میں داخل نہیں کرایا تھا؟"

"کرایا تھا۔" اُس نے کہا ـــــ "آٹھویں کے بعد کبھی سکول جاتا تھا اور بہت دن غیر حاضر رہتا تھا۔"

میں آپ کو پہلے کئی بار بتا چکا ہوں کہ پولیس والے چہرہ شناسی اور مزاج شناسی کے ماہر ہوتے ہیں۔ مجھ میں یہ وصف کچھ زیادہ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس ہندو کو جتنا پریشان، غمگین اور گھبرایا ہُوا ہونا چاہیے تھا وہ اس سے کوسوں دُور تھا۔ اس کے انداز سے بعض اوقات بے رُخی بلکہ لاتعلقی سی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے اُس کے اِس ردِّ عمل کو ذرا واضح کرنے کے لئے مصنوعی اُداسی سے کہا ـــــ "لالہ جی! اتنا خوبصورت بیٹا لاپتہ ہو جائے تو باپ بے چارہ تو جیتے جی مر جاتا ہے۔"

"ہاں مہاراج جی!" اُس نے احمقوں کی طرح دانت نکال کر اور ہنس کر کہا ـــــ "باپ کو بہت دُکھ ہوتا ہے۔"

اُس کی بے رُخی کی ایک وجہ تو میری سمجھ میں آتی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ لڑکا دکان پر نہیں بیٹھتا تھا۔ ہندو کا دھرم پیسہ اور دکان ہوتی ہے۔ لڑکا دکان پر نہ بیٹھے تو اُس کے دل سے لڑکے کا پیار نکل جاتا ہے۔ ہندو باپ کو ایسا نکھٹو بیٹا اچھا لگ ہی نہیں سکتا۔ میں نے اُسے کہا کہ لڑکے کی عادتوں اور اُس کے دوستوں کے متعلق کچھ بتائے۔

"اُس کے چار دوست ہیں۔" اس نے کہا ـــــ "چاروں مسلمان ہیں۔ ان چاروں نے اسے خراب کر دیا ہے۔ اُس میں مسلمانوں والی خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تمہارا بیٹا ماس (گوشت) کھاتا ہے۔ مسلمان لڑکے اُسے ماس کھلاتے رہتے ہیں۔ وہ کہیں نہ کہیں اکٹھے ہوتے اور گاتے بجاتے ہیں۔"

"آپ نے کہا تھا کہ اُس کا قد بُت اور شکل و صورت لڑکیوں جیسی ہے۔ گھر میں وہ زنانہ حرکتیں کرتا ہوگا؟"

"رام۔ رام۔ رام۔" اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا ـــــ "پکّا غنڈہ ہے۔ صرف ماں کے آگے چُپ رہتا ہے۔ میرے ساتھ اس طرح بات کرتا ہے جیسے میں نہیں وہ میرا باپ ہے۔ مسلمان لڑکوں نے اس کو اپنے جیسا بنا لیا ہے۔ باہر کسی کو اونچی بات نہیں کرنے دیتا۔ اُس نے میرے سامنے بازار میں اپنے سے دُگنے جسم کے ایک آدمی کو اُلٹا دیا تھا۔ مہاراج جی! سچ پوچھو تو میں اُس سے ڈرتا تھا۔"

"یہ گوشت کا اثر ہے لالہ جی!" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چھی، چھی، چھی۔" اُس نے حقارت سے کہا ـــــ "مہا پاپ ہے مہاراج جی!" اُس نے اچانک ہاتھ جوڑ دیے اور کھسیانہ سا ہو کر بولا ـــــ "ناراض نہ ہونا داروغہ مہاراج! آپ مسلمان ہیں۔ میں اپنے مذہب کی بات کرتا ہوں۔"

"میرا کوئی مذہب نہیں لالہ جی!" میں نے کہا ـــــ "میں صرف تھانیدار ہوں۔ آپ دل کی ہر ایک بات کریں تاکہ آپ کے بیٹے کو تلاش کرنے میں مجھے آسانی ہو۔"

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کی ان باتوں پر یقین کروں یا نہ کروں کہ لڑکا ہندو ہے، لڑکیوں کی ڈیل ڈول کا اور خوبصورت ہے اور وہ اتنا دلیر بھی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑکا اتنا دلیر نہیں ہو سکتا، یہ لالہ بہت بزدل ہے۔ میں نے اُس کے باپ سے پوچھا کہ لڑکے کا اس کے ساتھ اور اُس کا لڑکے کے ساتھ سلوک کیسا ہے۔ اُس نے بتایا کہ تین چار مہینوں سے اس کی لڑکے کے ساتھ بول چال بند تھی۔ لڑکا اس کا کہا نہیں مانتا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے بال کی کھال اتارنی شروع کی تو یہ انکشاف ہُوا کہ یہ ہندو اپنے بیٹے کو دو اڑھائی سال پہلے تک مارپیٹ بھی لیتا تھا، مگر اب لڑکے نے اُسے دھمکی دی تھی کہ اگر اُس نے ہاتھ اٹھایا تو وہ بھی اپنے ہاتھ دکھائے گا۔

"وہ گھر سے پیسے چوری کرتا ہوگا؟"

"کرتا ہوگا۔" اُس نے کہا ـــــ "ماں مجھے تھوڑا ہی بتاتی ہے۔ اُسی نے تو لڑکے کو بگاڑا ہے۔ اُسے پیسے دیتی ہے۔ ایک بار لڑکا دکان پر آیا اور مجھے ڈرا دھمکا کر پچیس روپے لے گیا تھا۔"

"اب وہ گیا ہے تو گھر سے کوئی رقم غائب ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" اُس نے جواب دیا ـــــ "اگر وہ چوری کر کے گیا ہے تو اُس کی ماں مجھے نہیں بتائے گی۔"

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔" میں نے کہا ـــــ "کہ لڑکے کے ساتھ آپ کا رویّہ اور تھا اور آپ کی بیوی کا کچھ اور۔"

"بالکل اُلٹ مہاراج!" اُس نے کہا ـــــ "میں لڑکے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ماں اُسے شہزادہ بناتی تھی۔ میں نے اس کی ماں سے ایک بار کہا کہ تمہارا بیٹا مسلمانوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور ماس کھاتا ہے۔ اگر اُس نے ماس نہ چھوڑا تو میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ یہ ملیچھوں کا گھر نہیں۔ اس کی ماں بیٹے سے زیادہ پاپن نکلی۔ بولی ـــــ 'میں نے خود ہی اسے کہہ رکھا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرو۔ میں پسند نہیں کرتی کہ یہ تم جیسے گھٹیا لوگوں کے ساتھ گھومے پھرے۔ مسلمانوں کے ساتھ اُٹھے بیٹھے گا تو اس کا دماغ کھُلے گا' ـــــ میں نے یہ سُنا تو چپ ہو رہا۔"

عورت رنگین مزاج تھی

یہ میرے لئے انکشاف تھا کہ لالہ اپنی بیوی سے دبکتا تھا اور اس کی بیوی اُس سے اُلٹ چلتی تھی اور یہ بھی کہ اس کی بیوی مسلمانوں کو پسند کرتی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عورت زندہ دل ہے اور اُسے یہ خاوند یقیناً پسند نہیں ہوگا۔ میں نے گہری جرح کی تو یہ واضح ہو گیا کہ اس ہندو کے دل میں اپنے بیٹے کے خلاف نفرت تھی۔ میں

نے اس سے یہ بھی کہلوا لیا کہ اگر اُسے بیوی مجبور نہ کرتی تو وہ بیٹے کے لاپتہ ہو جانے کی رپورٹ لکھانے نہ آتا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہندو کو اولاد سے زیادہ پیسے سے پیار ہوتا ہے۔ اگر اس کا بیٹا کماؤ ہوتا تو وہ دھاڑیں مارتا تھانے میں آتا۔

"آپ کی اولاد کیا ہے؟"

"اس لڑکے سے چار سال چھوٹا ایک لڑکا ہے۔" اُس نے جواب دیا ـــــ "اور اس سے تین سال چھوٹی ایک لڑکی ہے۔"

"انہیں اپنے قابو میں رکھنا لالہ جی!" میں نے کہا ـــــ "ماں انہیں بھی بگاڑ دے گی۔"

"انہیں وہ دوسرے طریقے سے بگاڑ رہی ہے۔" اُس نے کہا ـــــ "اُن سے ذرّہ بھر پیار نہیں کرتی اور انہیں مارتی ہے۔"

"کیوں"؟

"وہی جانے۔" اُس نے کہا ـــــ "اُس نے سارا پیار اِس لڑکے کو دے دیا ہے۔ چھوٹوں کی وہ دشمن ہے۔ میں ہی اُن کا خیال رکھتا ہوں۔ اس عورت پر چھوڑوں تو انہیں زہر دے دے۔ یہ لڑکا خود ہی کہیں چلا گیا ہوگا، لیکن اس ملیچھ عورت نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ رات اُس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ کہتی ہے میرے بیٹے کو لے آؤ ورنہ گھر نہ آنا۔"

یہ اُن کا گھریلو اور ازدواجی مسئلہ تھا کہ بچوں کے متعلق ماں کا رویّہ کیا اور باپ کا کیا ہے، لیکن میں نے ان کے اس اختلاف کو اہمیت دی۔ یہ واضح ہو چکا تھا کہ باپ کو لاپتہ لڑکے سے نفرت تھی اور ماں کو اس سے چھوٹوں سے نفرت تھی۔ لاپتہ لڑکا صرف یہ نہیں کہ دکان پر نہیں بیٹھتا تھا بلکہ باپ سے پیسے لے جاتا تھا۔ اِن حقائق کی روشنی میں مجھے یہ شک ہونے لگا کہ اس آدمی نے کسی پیشہ ور مجرم کو اُجرت دے کر لڑکے کو خود ہی غائب نہ کر دیا ہو۔ ہندو ہوتے تو بزدل ہیں لیکن جذبات سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ یہ دونوں اوصاف مل کر انسان

کو درندہ بنا دیتے ہیں۔ ایسا درندہ جو چوری چھپے حملہ کرتا ہے —
بہرحال میرے پاس ٹھوس اور مضبوط جواز آ گیا تھا کہ میں رپورٹ درج
کر لوں۔ مجھے گڑبڑ نظر آنے لگی تھی۔ میرے سامنے چار پہلو آئے:

لڑکا گھر سے پیسے چُرا کر کہیں چلا گیا ہے۔

لڑکے کو باپ نے غائب کرایا ہے۔

لڑکا زیادہ خوبصورت ہونے کی وجہ سے اغوا ہو گیا ہے۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ لڑکے کے ساتھ کسی مسلمان لڑکی کے
تعلقات ہوں گے جو لڑکی کے لواحقین پر ظاہر ہو گئے ہوں گے اور
اُنہوں نے لڑکے کو کہیں لے جا کر قتل کر دیا ہو گا۔

میں نے ان امکانات کو ذہن میں رکھ کر باپ سے چھان بین شروع
کر دی، لیکن اُس کے پاس یہی کچھ تھا کہ لڑکے کو ماں نے خراب کیا ہے
اور اُس کی ماں اچھی عورت نہیں۔ بیس پچیس روز پہلے قصبے میں ایک
تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ اُس دَور میں سینما ہال صرف بڑے بڑے
شہروں میں ہُوا کرتے تھے۔ تعداد بہت ہی کم ہوتی تھی۔ قصبوں میں
چلتے پھرتے سینما آتے تھے۔ قناتیں اور شامیانے تان کر دکھائے جاتے
تھے۔ ان کے علاوہ نہایت اعلیٰ قسم کے سرکس آتے تھے اور تھیٹر کمپنیاں
بھی آتی تھیں۔ قصبے کی آبادی اور اپنی آمدنی کے مطابق پندرہ بیس روز
ایک جگہ کھیل تماشہ دکھا کر اگلے قصبے میں چلے جاتے تھے۔ تھیٹر بھی
اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے۔ قصبے کے ساتھ میدان میں اونچی اونچی
قناتیں اور ان پر شامیانے لگا لیے جاتے۔ چبوترہ بنا کر سٹیج بنائی جاتی
اور پردوں کا نہایت اچھا انتظام ہوتا تھا۔

جس روز یہ ہندو اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے آیا اس
سے کوئی پندرہ روز پہلے ایک تھیٹر کمپنی قصبے میں ایک مہینہ کھیل دکھا
کر کہیں آگے چلی گئی تھی۔ اس کمپنی کا ذکر اس طرح آیا کہ اپنی بیوی اور
بیٹے کے پیار کی باتیں کرتے ہوتے اُس نے کہا ——" میری بیوی

دس بارہ مرتبہ تھیٹر دیکھنے گئی اور اپنے اس بیٹے کو ساتھ لے جاتی
تھی۔ چھوٹوں کو وہ کبھی بھی ساتھ نہیں لے گئی۔"

اس سے میں یہ سمجھا کہ عورت رنگین طبع ہے اور دلیر بھی ہے۔ مجھے
معلوم تھا کہ تھیٹر میں رات کو ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ شو رات بارہ
بجے کے بعد ختم ہوتا تھا۔ ہندو کھیل تماشہ دیکھنے کی عیاشی کرنے والے نہیں
تھے۔ یہ عورت من مانی کرنے والی اور پیسے کی پرواہ نہ کرنے والی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے باپ سے لڑکے کے دوستوں کے نام و پتے لیے اور
ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ انہیں تلاش کر کے تھانے لے آئے۔ رپورٹ
درج کی اور میں باپ کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ
اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج کر خود باہر رہے۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر وہ اندر
چلا گیا۔ اُس کی بیوی آئی۔ میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ عورت
اس شخص کی بیوی ہے۔ نہایت اچھے قدبُت کی خوبصورت عورت تھی۔
رنگ انگریزوں کی طرح گورا، آنکھیں خاص طور پر پُرکشش تھیں۔ کمرے میں
آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ روتی رہی ہے۔
میں نے یہ امکان پیشِ نظر رکھ کر کہ لڑکا خود گھر سے بھاگا ہے، اُس سے
پوچھا کہ اُس کا گھر میں کسی سے لڑائی جھگڑا ہُوا تھا اور کیا اُس کے انداز سے
کسی ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا؟

"لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا تھا" اُس نے جواب دیا —"باپ
اُس کے ساتھ کھچا کھچا رہتا تھا۔ اُسے بلاوجہ ٹوکتا اور حقارت سے دھتکارتا
تھا۔ اب ان کی بول چال ہی بند تھی، اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ
ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ میں اُسے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتی تھی"۔

"باپ اُسے دھتکارتا کیوں تھا؟" میں نے پوچھا اور کہا —" کوئی
بات دل میں نہ رکھنا۔ اس سے میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

"آپ مسلمان ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ میں نے ہاں کہی تو اُس
نے کہا ——" باپ میرے بیٹے کو اس لئے دھتکارتا تھا کہ باپ اصل

بنیا ہے اور بیٹے کی عادتیں مسلمانوں جیسی ہیں۔"

"کیا وہ تمہیں اس لیے اچھا لگتا ہے کہ اُس کی عادتیں مسلمانوں جیسی ہیں؟"

"یہی سمجھ لیں" اُس نے جواب دیا —— "مجھے پسند نہیں کہ میرا بیٹا باپ کی طرح تنگ نظر اور ہر وقت پیسے پیسے پر جھک مارتا رہے۔ باپ اُسے دُکان پر بٹھانا چاہتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ نہ اُٹھا بیٹھا کرو۔ میرا بیٹا مسلمانوں کی دوستی پسند کرتا اور خوش رہتا تھا۔ میری خوشی اُس کی خوشی میں ہے۔"

اس دوران اُس کے چھوٹے بچے، ایک لڑکا عمر گیارہ بارہ سال اور ایک بچی عمر آٹھ نو سال، کمرے کے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی میں جان گیا کہ اسی کے بچے ہیں، لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ وہ دونوں نقش و نگار کے لحاظ سے اپنے باپ پر گئے تھے۔ اُن کے رنگ بھی سانولے تھے۔ میں نے اُس سے پُوچھا کہ یہ اُس کے بچے ہیں؟ اُس نے پہلے تو دونوں کو ڈانٹ کر وہاں سے بھگایا پھر بے رُخی سے جواب دیا کہ یہ اُسی کے بچے ہیں۔

بیوی کو خاوند سے نفرت تھی

"لالہ جی بتاتے ہیں کہ آپ کا بڑا لڑکا بہت خوبصورت ہے۔" مَیں نے کہا۔

"بہت ہی خوبصورت" اُس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا —— "آپ اُسے دیکھیں تو کہیں کہ اسے تو گرم ہوا بھی نہ لگے۔"

"اُس کی عادتیں کیسی ہیں؟"

"خوش رہنے اور خوش رکھنے والا لڑکا ہے" اُس نے جواب دیا —— "غصے میں آجائے تو کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ کسی سے ڈرتا نہیں۔ لڑا کے مسلمانوں کی طرح دلیر اور بہادر ہے۔"

"مثلاً کیا بہادری کرتا تھا" میں نے پُوچھا —— "باپ کا کہا نہیں مانتا تھا۔ باپ بات کرے تو اُسے کھری کھری سُنا دیتا تھا۔"

"یہ تو عادتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ فلاں انسان کیا کچھ کر سکتا ہے" اُس نے کہا —— "وہ چونکہ بہت خوبصورت ہے اور لڑکیوں کی طرح لگتا ہے اس لئے کوئی اسے چھیڑ دیتا ہے۔ اگر کوئی مذاق میں چھیڑے تو مذاق میں جواب دیتا ہے اور اگر کوئی اُسے پریشان کرنے کی کوشش کرے تو اُس کی پٹائی کر دیتا ہے۔ مجھے اس کی تین لڑائیاں معلوم ہیں تینوں مسلمانوں کے ساتھ ہوئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ اس کا غم لگا رہتا تھا لیکن اس کے مسلمان دوست مجھے تسلّی دیتے ہیں کہ یہ کسی سے مار نہیں کھاتا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ اس کے یہ مسلمان دوست لڑائی جھگڑے میں اسے اکیلا نہیں رہنے دیتے۔ تین چار مہینے گزرے وہ اِس حالت میں گھر آیا کہ قمیض تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی اور ایک بازو سے خون بہ رہا تھا۔ میں پریشان ہو گئی کہ آج مار کھا کر آیا ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کے دو دوست تھے۔ اُن سے پتہ چلا کہ بڑی سڑک پر ایک یکے کا گھوڑا بے لگام ہو کر سرپٹ دوڑا آ رہا تھا۔ یکے میں تین چار سواریاں تھیں۔ یکے بان سے گھوڑا قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ راستے میں میرا بیٹا اپنے ان دو دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تینوں یکے کے ساتھ دوڑ پڑے۔ میرا بیٹا گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑا۔ یکے کا بم پکڑ کر اُچھلا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر اُس کی گردن تک پہنچ گیا۔ اس کے دونوں دوست بھی اُسی کی طرح گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ میرے بیٹے نے آگے جُھک کر لگام پکڑی اور گھوڑے کو قابو میں کر کے روک لیا۔"

وہ ماں تھی۔ اپنے بیٹے کی بہادری کے کارنامے اس طرح سُنا رہی تھی جیسے وہ رستمِ زماں تھا۔ تاہم میں نے یہ اخذ کر لیا کہ لڑکا لڑکیوں جیسا تھا لیکن اُس میں مردانگی تھی اور وہ ہندوؤں کی طرح بزدل نہیں تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ماں بھی کُشادہ طبیعت کی تھی اور وہ مردانگی کو پسند کرتی تھی۔ اُس کی صحت ایسی اچھی تھی کہ میں اسے پچیس چھبیس سال کی سمجھ رہا تھا لیکن وہ تینتیس چونتیس سال کی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں

اس کی شادی ہوگئی تھی اور ایک ہی سال بعد یہ لڑکا پیدا ہُوا تھا۔

"تمہیں شاید معلوم ہو کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟"

"شاید ہو۔" اُس نے جواب دیا ــــ "میں کسی کا نام نہیں بتا سکتی۔ اُس کے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے۔"

"کسی لڑکی کے ساتھ میل ملاپ؟"

"یہ بھی اُس کے دوستوں کو معلوم ہوگا۔" اس نے کہا ــــ "مجھے ڈر ہے کہ کسی نے دشمنی سے اس پر وار نہ کیا ہو۔"

"کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ گھر سے بھاگا نہیں؟"

"مجھے پُورا یقین ہے وہ بھاگا نہیں۔" اُس نے جواب دیا، پھر بولی ــــ "باپ اُسے بہت تنگ کرتا تھا لیکن میری موجودگی میں اُسے کوئی تکلیف اور شکایت نہیں تھی۔"

"سُنا ہے اس کے باپ کو تم بہت تنگ کرتی ہو؟" میں نے ایک مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

وہ بھی مُسکرائی۔ اُس نے سر جھکایا اور دھیمے سے بولی ــــ "آپ نے ٹھیک سُنا ہے۔"

"یہ جوڑ کس نے ملایا تھا؟"

"میرے کرموں میں یہی لکھا تھا۔" اس نے کہا ــــ "اگر میرا یہ بیٹا نہ ہوتا تو میں اس آدمی کو زہر دے دیتی یا خود زہر کھا لیتی۔"

"کیا تم یہ شک کر سکتی ہو کہ لڑکے کو اسی نے غائب کرایا ہے؟"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی ــــ "ہو سکتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہاں ہاں آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔ آدمی کمینہ ہے اور کینہ رکھنے والا ہے۔"

"اُسے ایسا اشارہ بھی نہ دینا کہ مجھے یا تمہیں ایسا شک ہے۔" میں نے کہا ــــ "اب جو کچھ کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔"

نام کا ہندو، فطرت کا مسلمان

اس عورت سے مجھے کوئی سراغ نہ مِلا، سوائے اس کے کہ وہ اپنے اس بیٹے سے والہانہ پیار کرتی تھی اور چھوٹے بچّوں اور اپنے خاوند سے اُسے نفرت تھی۔ وہ مجھے کوئی نئی بات نہ بتا سکی۔ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ لڑکا خود نہیں گیا۔ میں نے اس عورت کو الگ اور اس کے خاوند کو الگ کہا کہ اپنے طور پر سُراغ لگانے کی کوشش کرتے رہیں۔ میں مختلف شکوک کے تانے بانے میں اُلجھا ہُوا تھانے گیا۔ وہاں لڑکے کے دوست آئے بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے پُوچھا کہ وہ کس کس کے بیٹے ہیں اور کون کون سے خاندان سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک امیر کبیر گھرانے کا نوجوان تھا۔ باقی تین متوسط طبقے کے تھے۔ میں نے انہیں اکیلے اکیلے اندر بلایا۔ ہر ایک نے ایک دوسرے کے بیان کی تائید کی۔ ان کے مطابق لڑکا خوبصورت، گورے رنگ کا اور سُریلی آواز والا تھا۔ انہوں نے اُس کی مردانگی کی بھی تعریف کی اور یہ بھی بتایا کہ اُسے اپنے باپ سے اتنی نفرت تھی کہ کہا کرتا تھا کہ ہو سکتا ہے میں اس بنیئے کو قتل کر دوں۔ ہم اسے ٹھنڈا کیے رکھتے تھے کہ اُسے سزائے موت ہو جائے گی یا وہ بیس سال کے لئے جیل خانے میں بند ہو جائے گا۔

"اپنے باپ کے خلاف اُسے سب سے بڑی شکایت کیا تھی؟" میں نے چاروں لڑکوں سے پوچھا۔

چاروں کا جواب ایک جیسا تھا ــــ "وہ اکثر کہا کرتا تھا ــــ 'یہ شخص میری ماں کا نوکر کہلانے کے بھی قابل نہیں' ــــ وہ باپ کو پریشان کرنے کے لئے سکول سے بھاگا اور اُس نے دکان پر بیٹھنے سے بھی صاف انکار کر دیا ہے۔"

"کیا وہ واقعی گوشت کھاتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"صرف بکرے کا ہی نہیں" ــــ انہوں نے جواب دیا ــــ "گائے کا

بھی"۔۔۔ ان میں جو لڑکا امیر گھرانے کا تھا وہ اپنے گھر میں گوشت پکوایا کرتا تھا۔ گائے کا گوشت اس ہندو لڑکے کو کبھی دھوکے میں نہیں کھلایا گیا تھا۔ وہ گائے کے گوشت کی فرمائش کیا کرتا تھا۔ یہ چاروں نوجوان اس لڑکے سے تین تین چار چار سال بڑے تھے۔ خوش طبع نوجوان تھے۔ مجھ سے ذرہ بھر نہ ڈرے، نہ میں نے انہیں ڈرانے کی کوشش کی۔ بے تکلّفی سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسی بے تکلّفی سے انہیں کہا۔۔۔ "میں نے اُس کی ماں دیکھی ہے اور باپ بھی دیکھا ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ لڑکا اگر ایسا ہی ہے جیسا تم بتاتے ہو تو یہ اس باپ کا بیٹا نہیں، کسی مسلمان کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔"

وہ چاروں سنجیدہ ہوگئے۔ ایک نے دوسروں سے کہا۔۔۔ "کہو یار! ہم نے آپس میں دو تین بار یہی بات نہیں کی کہ یہ لڑکا اِس لالے کا نہیں لگتا"۔۔۔ اُس نے مجھ سے کہا۔۔۔ "خدا کی قسم' وہ نام کا ہندو ہے۔ اُس کی ساری خصلتیں مسلمانوں جیسی ہیں۔"

"مجھے ایک بات سچ سچ بتا دو"۔ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اس کا کسی لڑکی کے ساتھ دوستانہ تھا؟"

"نہیں!" اُنہوں نے متفقہ جواب دیا۔۔۔ "ہم میں کوئی ایسی ویسی عادت نہیں۔ ہم سگریٹ تک نہیں پیتے۔ گانے بجانے کا شوق ہے جو کہیں بیٹھ کر پُورا کر لیتے ہیں۔ لڑائی مار کٹائی بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہمارے چال چلن کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتا۔"

میں یہ بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ان چاروں میں ہی رقابت نہ ہو اور ان میں سے کسی نے یا چاروں نے لڑکے کو اِس دنیا سے ہی غائب نہ کر دیا ہو۔ مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ میرے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ انہی کی عمر کے دو نوجوان اِس لڑکے کے ساتھ دوستی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ آوارہ

سے تھے اس لئے اس لڑکے نے اُن کی دوستی قبول نہیں کی تھی۔ میرے پوچھنے پر اُنہوں نے بتایا کہ یہ دونوں آدمی ایسے دلیر یا بدمعاش نہیں کہ انہوں نے لڑکے کو کہیں غائب کر دیا ہوگا۔

"وہ تمہیں آخری بار کب ملا تھا؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے تین روز پہلے کا دن بتایا۔ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اُس کی کسی بات سے یہ شک نہیں ہوتا تھا کہ اُس کا غائب ہونے کا ارادہ ہے۔ دوستی اتنی گہری تھی کہ وہ انہیں بتائے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے اگلے روز ملنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اگلے روز شام کے وقت اُس کے باپ نے اُن سے اُس کے متعلق پوچھا۔ پھر اُس کی ماں نے اُن میں سے دو لڑکوں کے گھر جا کر پُوچھا۔ تب انہیں پتہ چلا کہ وہ رات کو غائب ہوگیا تھا، یعنی صبح وہ اپنے بستر پر نہیں تھا۔

"باپ نے کس لہجے میں پوچھا تھا؟"

"اُس نے کہا تھا۔۔۔ 'اوئے، وہ لفنگا کہاں ہے؟ اس کی ماں کو بتاؤ سالا ڈوب کر مر گیا ہے'۔۔۔ اُس کے لہجے میں طنز تھی جیسے اُسے پرواہ ہی نہیں تھی کہ وہ گھر میں ہے یا غائب ہے۔"

"اور ماں کا رویّہ کیسا تھا؟"

"وہ تو بیچاری بہت ہی پریشان تھی"۔ انہوں نے بتایا۔ "روتی تھی"۔

اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ لڑکے کا باپ اس کی گمشدگی پر خوش تھا۔ اِس یقین نے میرا یہ شک کسی حد تک پختہ کر دیا کہ لڑکے کو اسی نے غائب کرایا ہے۔ اگر مجھے گمشدگی کی رات کی صبح اطلاع مل جاتی تو میں فوراً جا کر بستر دیکھتا۔ کھُرا کھوج ڈھونڈتا۔ بستر کو سونگھتا۔ ہو سکتا تھا کہ رات سوتے میں اُس کی ناک پر کلوروفارم رکھی گئی اور اُسے اٹھا لے گئے۔ اگر اُسے اندر سے اٹھایا گیا تو اٹھانے والے اندر کس طرح آئے؟ ہو سکتا تھا کہ باپ نے اندر سے دروازہ کھولا ہو۔ اب ایسے سراغ ڈھونڈنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب تو مجھے لالے کے سینے سے بھید نکالنا تھا۔ یہ کام میرے لئے آسان نہیں تھا کیونکہ کٹر ہندو کا سینہ بڑا گہرا اور بڑا تاریک ہوتا ہے۔

بندو کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت کون سا پینترا بدل جائے۔ مجھے کچھ نہ کچھ شہادت اور ہلکے سے جواز کی ضرورت تھی۔

ایک رقعہ اور پُراسرار آدمی

میں نے پولیس کے خفیہ طریقۂ کار کے مطابق مخبروں کو سرگرم کر دیا اور دو مخبر لڑکے کے باپ کے پیچھے لگا دیئے۔ ایک اُس کی دکان پر نظر رکھتا تھا اور دوسرا اُس کے گھر پر۔ گھر والے مخبر کو میں نے کہا تھا کہ لڑکے کی ماں پر بھی نظر رکھے۔ مخبروں میں دو عورتیں بھی تھیں۔ تین دن گزر گئے۔ مخبروں نے کوئی قیمتی خبر نہ دی۔ عورتیں بھی کوئی خبر نہ لائیں۔ البتہ ان عورتوں نے یہ کہانی سنائی کہ لڑکے کی ماں کی جب شادی ہوئی تو اُس وقت لڑکے کا دادا زندہ تھا۔ اُس نے آڑھت کی دکان پر ایک مسلمان منشی رکھا ہُوا تھا جو اُن کے گھر بھی آتا تھا۔ وہ بڑا وجیہہ اور خوبرو جوان تھا۔ لوگ اُس کے اور لڑکے کی ماں کے متعلق مشکوک سی باتیں کیا کرتے تھے۔ پھر یہ منشی کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اس کے بعد لڑکے کی ماں نے اپنے خاوند کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی تھی جو ابھی تک یعنی سولہ سترہ سال تک چلی آرہی تھی۔ اس کے سوا لڑکے کی ماں کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات سُننے میں نہیں آئی۔ لالے کے متعلق بتایا گیا کہ بیوی سے بے حد ڈرتا ہے اور اگر بیوی اس خاوند کو رات بھر باہر کھڑا رکھے تو باہر کھڑا رہے گا۔

یہ اطلاع میرے لئے اہم نہیں تھی۔ اس سے یہی پتہ چلتا تھا کہ میاں بیوی میں محبّت اور چاہت نہیں۔ البتہ مجھے یہ خیال آیا کہ ہوسکتا ہے لالے کو اپنی بیوی اور منشی کے متعلق شبہ ہوا اور وہ گمشدہ لڑکے کو اپنا لڑکا سمجھتا ہی نہ ہو۔ یہ بھی تو اُس نفرت کی وجہ ہوسکتی تھی جو باپ کے دل میں تھی۔ میں نے اس پہلو پر بہت غور کیا اور اس کا تعلق اغوا سے جوڑنے کی کوشش کی۔ میری سوچیں گھوم پھر کر مجھے لڑکے کے باپ پر لے آتی تھیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ لڑکے کی ماں کے پاس ایک بار پھر جاؤں اور اُس سے پُوچھوں کہ اُس رات لڑکا باہر تو نہیں نکلا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ باہر نکل گیا ہو۔ ماں سوگئی ہو۔ لڑکا باہر سے ہی اغوا ہوگیا ہو، اور صبح ماں نے سمجھا ہو کہ وہ گھر آگیا تھا اور یہاں سے غائب ہوگیا ہے۔

میں نے لڑکے کی ماں کے پاس جانے کا فیصلہ کیا اور سوچنے لگا کہ کس وقت جاؤں۔ اتنے میں وہ مخبر آگیا جسے میں نے اُس کے گھر کی نگرانی پر لگایا تھا۔ وہ دوڑتا آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایک آدمی آیا اور آہستہ آہستہ چلتا لالے کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھتا آگے چلا گیا۔ مخبر اپنے طریقۂ کار کے مطابق اِدھر اُدھر ہو کر دیکھتا رہا۔ وہ آدمی آگے جا کر رُکا پھر واپس ہُوا۔ وہ پھر لالے کے دروازے کے قریب آہستہ ہوگیا۔ وہ شاید رُکنے لگا تھا لیکن اُدھر سے دو تین لڑکیاں آگئیں۔ وہ آدمی تیز چل پڑا اور آگے جا کر رُک گیا۔ اُس کی حرکتیں مشکوک تھیں۔ وہ پھر واپس آیا اور لالے کے دروازے پر رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس نے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ مارا اور اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور اندر ہوگیا۔ مخبر چل پڑا اور دروازے کے آگے سے گزرتے اُدھر دیکھا۔ اندر لڑکے کی ماں کھڑی تھی اور ایک کاغذ پڑھ رہی تھی۔ وہ آدمی چلا گیا۔ مخبر نے اُس کا پیچھا کیا۔ اب وہ آدمی تیز چل رہا تھا۔ وہ اڈے پر جا کر لاری میں بیٹھ گیا۔ مخبر اُسے نہ گرفتار کرسکتا تھا نہ روک سکتا تھا۔ وہ دوڑتا ہُوا میرے پاس آگیا۔

میں فوراً اُٹھا۔ مخبر کو ساتھ لیا اور اس ارادے سے اڈّے کی طرف چل پڑا کہ اُس آدمی کو روک لوں گا یا مخبر کو لاری میں بٹھا دوں گا تاکہ یہ اس آدمی کا پیچھا کرے۔ پولیس کی مجبوری دیکھیے کہ ہمارے پاس کوئی تیز رفتار سواری نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے پولیس سٹیشنوں میں آج بھی موٹر یا جیپ نہیں ہے۔ اڈے پر پہنچے تو لاری جا چکی تھی۔ مخبر نے تفصیل سُنا کر مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ یہ آدمی کسی کا پیغام لایا تھا۔ یہ لڑکے کے متعلق ہو

سکتا تھا۔ میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ یہ امکان بھی تھا کہ لڑکے کی ماں
نے لڑکے کو خود غائب کر کے اپنے خاوند کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی
ہو گی۔ عورت بہرحال تیز طرّار تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ خفیہ سودا بازی
کرنا چاہتی ہو گی۔

میں اُس کے گھر چلا گیا۔ میں نے پہلی بات یہ نوٹ کی کہ وہ اب
غمگین نہیں تھی۔ نہایت شگفتہ طریقے سے اُس نے میرا استقبال کیا اور
ہنستی مسکراتی باتیں کرنے لگی۔ مجھے کچھ ایسا اطمینان ہونے لگا جیسے وہ
کہے گی کہ لڑکا مِل گیا ہے، مگر اس نے کوئی ایسی خوشخبری نہ سنائی بلکہ مجھ
سے پُوچھا ــــ "اتنے دن گزر گئے ہیں، میرے بچّے کا کچھ پتہ نہیں چلا؟"

میں بُجھ گیا۔ میرا اطمینان ختم ہو گیا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور اپنے
سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مثلاً وہ کہاں سویا تھا، اُس رات باہر نکلا
تھا وغیرہ۔ میں اس دوران اُس کے ساتھ بے تکلفی کی باتیں بھی کرتا رہا۔
میں نے اسی بے تکلفی میں اُس سے پُوچھا ــــ "آج رقعہ کہاں سے
آیا تھا؟ وہ آدمی کون تھا؟"

اُس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ آنکھیں کُھل گئیں۔ شگفتگی ختم
ہو گئی۔ اس ردِّعمل کے بعد مجھے کسی جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس
نے دھیمی سی آواز سے کہا ــــ "مجھے کوئی رقعہ نہیں ملا۔ یہاں کوئی آدمی
نہیں آیا تھا۔ آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"شاید دکان سے کوئی آدمی آیا ہو گا۔" میں نے کہا ــــ "لالہ جی
نے کوئی پیغام بھیجا ہو گا۔"

"ہاں ہاں۔" اُس نے چہک کر کہا ــــ "اُنہوں نے اپنا آدمی
بھیجا تھا کہ وہ رات کو دیر سے آئیں گے۔"

"تم تو ڈر ہی گئی تھیں!" میں نے کہا۔

"پولیس سے مجھے بہت ڈر آتا ہے۔" وہ پھر شگفتہ ہو گئی۔

میں وہاں سے کوئی اور ہی شک لے کر نکلا۔ جو کچھ تھا وہ میاں

بیوی کے درمیان تھا۔ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے
تھا، مگر میں رپورٹ درج کر کے پھنس گیا تھا۔ مجھے پوری تفتیش اور کارروائی
کرنی تھی۔ میں نے ذاتی طور پر محسوس کیا کہ واردات دلچسپ ہے۔ میں
لالے کی دکان پر چلا گیا۔ لالہ جس طرح مجھے دیکھ کر اٹھا اس سے مجھے جوکر
یاد آ گئے۔ میں نے اُسے الگ لے جا کر پوچھا ــ "آپ نے گھر کسی کے
ہاتھ یہ رقعہ لکھ کر بھیجا ہے کہ آپ رات دیر سے گھر جائیں گے؟"

"نہیں تو!" اُس نے جواب دیا ــــ "کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا ــــ "میں آپ کی بیوی سے دو
چار باتیں پُوچھنے آپ کے گھر گیا تھا۔ آپ کے متعلق پُوچھا تو پتہ چلا کہ آپ
دیر سے گھر آئیں گے ..... گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"آپ نے رقعے کا ذکر کیا تھا۔" اُس نے کہا ــــ "میں نے
زبانی بھی کوئی پیغام نہیں بھیجا اور رقعہ بھی نہیں بھیجا۔ شام ہو رہی ہے۔ میں
گھر جا رہا ہوں۔"

"جانے دو لالہ جی!" میں نے کہا ــــ "میں بھی گھر جا رہا ہوں۔"

میں تھانے چلا گیا۔ میرے ذہن پر یہ رقعہ اور وہ آدمی سوار تھا۔
مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس عورت کو اپنے خاوند سے نفرت ہے۔ اس نے
کسی اور سے دوستانہ گانٹھ رکھا ہو گا۔ یہ اُس آدمی کا رقعہ ہو گا۔ تھانے میں دو
نئے کیس آ گئے تھے۔ میں ان میں مصروف ہو گیا۔ دو دن اور گزر گئے۔

لڑکے کی قیمت پانچ ہزار روپے ورنہ قتل

دوپہر کا وقت تھا۔ لالہ میرے دفتر میں داخل ہُوا۔ بُری طرح گھبرایا
ہُوا تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی
تھی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا ــــ "داروغہ جی مہاراج! مجھے
بچاؤ۔ میں تباہ ہو گیا" ــــ اُس نے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا

اور ایک کاغذ نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے کھولا تو یہ ہندی میں لکھا ہُوا تھا۔ میں اِن ہندؤوں کے ساتھ ہندوستان میں ایک زمانہ رہا ہوں۔ مجھے ہندی سیکھ لینی چاہیئے تھی، لیکن ہندؤوں سے مجھے اتنی نفرت تھی کہ دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اُن کی زبان سیکھوں۔ میں نے اپنے منشی کو بُلایا اور کہا کہ یہ پڑھ کر مجھے سُنائے۔ اُس نے پڑھا ——

"اپنے بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو پانچ ہزار روپیہ ادا کر دو۔ میرا ایک آدمی تمھارے پاس آئے گا۔ خاموشی سے اسے پانچ ہزار روپیہ دے دینا۔ اگر تم نے میرے آدمی کو پکڑ وا دیا تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر تم نے پانچ ہزار روپیہ نہ دیا تو تمہیں بیٹے کی لاش ملے گی۔"

اُس کے بیان کے مطابق ایک آدمی آیا اور اُس کے آگے یہ کاغذ پھینک کر چلا گیا۔ کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔ ڈاک سے آتا تو لفافے پر اُس جگہ کی مہر ہوتی جہاں سے پوسٹ کیا جاتا۔ رقعہ دستی آیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ لڑکے کی ماں کو بھی رقعہ ملا ہے۔ کیا اس میں بھی یہی مطالبہ اور یہی دھمکی ہوگی؟ مگر وہ خوش تھی۔ شاید اس وجہ سے خوش ہو کہ پانچ ہزار روپے ادا کر کے اپنے بیٹے کو چھڑا لے گی، مگر اُس نے اپنے خاوند سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ شاید چوری چھپے رقم دینا چاہتی ہو گی تاکہ پولیس کو اطلاع نہ مل جائے۔

"آپ یہ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"میں کیوں ادا کروں جی؟" اُس نے جواب دیا —— "یہ لڑکا تو پانچ پیسے کا نہیں، میں پانچ ہزار روپیہ کیوں دوں؟"

"اس سے پہلے بیوی نے آپ کو کچھ بتایا تھا کہ کسی نے یہ مطالبہ کیا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"اُس کے ساتھ تو میں بولتا ہی نہیں۔" لالے نے جواب دیا ذرا سوچ کر وہ بڑبڑا کر بولا —— "ہو سکتا ہے اُسے بھی ایسا رقعہ ملا ہو۔ اُس نے گھر میں بہت رقم رکھی ہوئی ہے۔ اُس کے پاس خالص سونے کے زیورات ہیں۔ وہ ملیچھ رقم ادا کر دے گی۔ وہ میری کمائی میں پانی ڈالے

گی۔ میں اُسے روک دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ بُجھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ——

"مہاراج جی! اُسے آپ روکیں میری رقم برباد نہ کرے۔"

"دیکھو لالہ جی!" میں نے اُسے کہا —— "آپ دکان پر جا بیٹھیں۔ میں آپ کو ایک آدمی دکھا دوں گا۔ وہ ہر وقت آپ کی دکان کے اردگرد گھومتا پھرتا رہے گا۔ جو آدمی آپ سے رقم لینے آئے گا وہ آپ کو للکارے گا نہیں۔ دکان میں آکر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ آہستہ سے بات کرے گا۔ اگر اُسے موقع ملا تو چاقو یا پستول دکھائے گا۔ اگر ایسا ہُوا تو میرا آدمی وہاں موجود ہو گا۔ آپ اُس کی طرف دیکھ کر اپنا بایاں ہاتھ اپنی پگڑی کے اُوپر اس طرح رکھیں جیسے آپ پگڑی ٹھیک کر رہے ہیں۔ میرا آدمی اِس اشارے پر پہنچ جائے گا۔ وہاں میرا اور انتظام بھی ہو گا۔ یہ خیال رکھنا کہ اُس آدمی کو، جو رقم لینے آئے گا، دیکھ کر بھاگنے کی یا شور شرابا کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

میں اُسے ہدایات دیتا رہا اور اُس کا رنگ اُڑتا گیا۔ وہ صرف رویا نہیں باقی کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ لڑکے کا یہ سراغ مل گیا ہے کہ وہ پیشہ ور مجرموں کے پاس ہے۔ میرے دل سے یہ شکوک نکل گئے کہ اُسے باپ نے یا ماں نے کسی غرض سے غائب کرایا ہے یا کسی دوست نے کسی وجہ سے اُسے انتقامی اقدام کا نشانہ بنایا ہے۔ اغوا کرنے والے پیشہ وروں کو پکڑنا بھی آسان نہیں تھا، لیکن یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ میرا ٹارگٹ یا میری منزل کیا ہے۔ مجرموں کو پکڑنے کے لئے مجھے اُس ہندو کے تعاون کی ضرورت تھی۔ مجھے اس کے مارے جانے کا بھی ڈر تھا اور مجرموں کا ہاتھ سے نکل جانے کا بھی خطرہ تھا۔ میں لالے کو جتنا دلیر بنانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اتنا ہی بزدل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے رویّے سے مجھے اپنا پھندا کمزور نظر آتا تھا۔

"داروغہ جی مہاراج!" اُس نے اچانک بھڑک کر کہا —— "میری سمجھ میں ایک اور بات آئی ہے۔ یہی اصل بات ہے۔" اُس نے

اپنے بیٹے کو گالی دے کر کہا ——— "یہ خط اُس نے خود لکھوایا ہے۔ وہ خود گھر سے بھاگ گیا ہے اور مجھ سے رقم بٹورنے کے لئے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔"

"پھر بھی میرا فرض بدل نہیں جاتا۔" میں نے اُسے کہا ——— "رقم کا مطالبہ کرنے کا جُرم جس نے بھی کیا ہے میں اُسے پکڑوں گا۔ وہ خواہ آپ کا بیٹا ہو یا آپ کی بیوی یا کوئی ڈاکو۔ اگر آپ نے حوصلہ قائم نہ رکھا تو آپ مارے جائیں گے یا رقم دے بیٹھیں گے اور میں منہ دیکھتا رہ جاؤں گا۔"

اُس نے بات پتے کی کہی تھی۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ لڑکا دلیر ہے اور غنڈہ گردی بھی کر سکتا ہے، یہ مانا جا سکتا تھا کہ رقم کا مطالبہ اسی نے کیا ہو۔ یہیں سے مجھے ایک خیال اور آیا۔ لڑکے کی ماں بھی اس میں شامل ہوگی۔ میرے ذہن میں وہ رقعہ تھا جو وہ پُراسرار آدمی اس عورت کو دے گیا تھا۔ اس رقعے کے متعلق اُس نے جھوٹ بھی بولا تھا۔ اس عورت کو بھی گھیرنے کی ضرورت تھی، لیکن مجرم خواہ کوئی بھی تھا اُس نے رقم کا مطالبہ کر کے خود ہی پھنسنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں اب اسی پھندے کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے میں نے سوچا کہ لڑکے کی ماں کو نہ چھیڑا جائے تاکہ اُسے شک نہ ہو کہ اُس پر شک کیا جا رہا ہے۔ میں نے لالے کو ہر طرح کی ہدایات دے کر اور اُس کے حوصلے کو مضبوط کر کے بھیج دیا لیکن وہ پہلے سے زیادہ کانپ رہا تھا۔

میں نے ایک مخبر کو چھابڑی والا بنا کر آڑھت منڈی میں لالے کی دکان کے بالمقابل بیٹھنے کو کہا۔ تین اور آدمی اس کے قریب گھومنے پھرنے کے لئے بھیج دیئے۔ "چھابڑی والے" سے کہا کہ وہ خود ہی لالے سے اپنا تعارف کرا دے اور اُسے پگڑی پر بایاں ہاتھ رکھنے کا اشارہ سمجھا دے۔ یہ ہوشیار مخبر تھا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ کوئی نامی گرامی جاسوس اور سراغرساں تھا اور شاید پڑھا لکھا بھی ہوگا یا وہ سکاٹ لینڈ یارڈ کا ڈگری یافتہ ہوگا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ محنت مزدوری کرتا تھا اور کہیں کام نہ ملے تو اتنی سی چوری کر لیا کرتا تھا

کہ دو چار دن اپنے کنبے کو روٹی کھلا سکے یا جواریوں کی چوکیداری کر کے کچھ پیسے کما لیتا تھا۔ نہایت کارآمد، قابلِ اعتماد اور ذہین مخبر تھا۔ میں نے ایسا ہی ایک مخبر لالے کی گلی میں گھومنے پھرنے اور اس کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے بھی لگا رکھا تھا۔ اب ایک عورت کا وہاں اضافہ کر دیا۔

عورت پُراسرار تھی

پھندا تیار کر کے میں کسی اچھی خبر کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے دن شام سے کچھ دیر پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ اس سازش میں لڑکے کی ماں بھی شریک ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رقم لینے کے لئے کوئی مجرم لالے کے گھر پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہُوا تو لڑکے کی ماں فوراً رقم دے دے گی۔ وہ آخر ماں تھی اور ماں بھی ایسی جو لڑکے پر جان فدا کرتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو آزاد کرانے کے لئے رقم بھی دے دے گی اور خود بھی ساتھ چل پڑے گی۔ اگر لڑکا خود مجرم نہیں تو وہ جن کے قبضے میں ہے انہیں وہ کہے گا کہ باپ سے کچھ وصول کرنا ممکن نہیں، میری ماں کے پاس جاؤ۔ یہیں سے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ لڑکے کو معلوم تھا کہ باپ اس سے نفرت کرتا ہے اور وہ رقم نہیں دے گا، پھر اُس نے یہ رقعہ اپنے باپ کی طرف کیوں بھجوایا؟ اپنی ماں کو کیوں نہ بھجوایا؟ ——— میرا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا۔ تفتیش کی ناکامی اور کامیابی میں ایک بال جتنا فرق ہوتا ہے۔ نہایت معمولی سی بھول چوک یا غلط حرکت چاروں طرف اندھیرا کر دیتی ہے اور مجرم ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ اس کیس میں مجھے سو فیصد بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہوشیار ہونا تھا۔ مجرم رقم لے کر نکل جاتے تو یہ میرے لئے شرمناک شکست تھی۔

میں لالے کے گھر چلا گیا۔ وہ دکان پر تھا۔ اُس کی بیوی سے ملا۔ وہ اب بھی خوش خوش نظر آتی تھی، مگر اب مجھے اس کا حُسن اور خوشی پُراسرار

سی لگ رہی تھی۔ میں نے بے تکلفی اور دوستانہ انداز سے باتیں شروع کیں
پھر اپنا مخصوص انداز اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اُسے اپنے مطلب پر لایا۔
اُس کا ردِّ عمل اور چہرے پر آتے جاتے تاثرات بھی دیکھتا رہا۔ یہ میرا وہم
بھی ہو سکتا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ عورت مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے
اُس نے میرے ساتھ اشارے میں بھی ذکر نہ کیا کہ اُس کے خاوند کو رقعہ ملا
ہے کہ اپنا بیٹا زندہ واپس لینا چاہتے ہو تو پانچ ہزار روپیہ ادا کر دو۔ اس
کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ اس مطالبے اور جرم میں یہ بھی
ملوّث ہے اور دوسری یہ کہ خاوند نے اُسے بتایا ہی نہیں کہ کوئی ایسا
مطالبہ آیا ہے۔ خاوند کو یہ ڈر ہو گا کہ بیوی فوراً رقم ادا کر دے گی۔

میں نے ہیرا پھیری ترک کر کے سیدھی بات کی۔ میں نے پوچھا ——
"اپنے بیٹے کو واپس لینے کے لئے تم پانچ ہزار روپیہ ادا کر سکتی ہو؟"

"دس ہزار بھی دے سکتی ہوں"۔ اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے
میں نے مذاق کیا ہو۔ کہنے لگی —— "میں اپنا آپ بیچ کر بھی اپنے بچّے کو واپس
لے آؤں گی ..... آپ نے کیوں پوچھا ہے؟"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا بیٹا جن کے پاس ہے انہوں نے پانچ
ہزار روپے کا مطالبہ کیا ہے؟"

"نہیں!" اُس نے گھبرا کر کہا —— "ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو
کیسے پتہ چلا ہے؟"

"ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے پوری بات بتائیں"۔ وہ بہت ہی زیادہ گھبرا گئی تھی۔ اُٹھ
کر میرے قریب آ بیٹھی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی —— "یہ
کیا معاملہ ہے؟ آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

"آپ کو خاوند نے بتایا نہیں؟"

"نہیں"۔ اُس نے کہا —— "اُس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا"۔

میں نے اُسے بتا دیا کہ اُس کے خاوند کو کیا مطالبہ اور کیا دھمکی ملی ہے

اُس نے جب سنا کہ اگر رقم نہ ملی تو لڑکے کو قتل کر دیا جائے گا تو اس نے دونوں
ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ لیا۔ رو کر کہنے لگی —— "ایسا نہ کہو۔ رقم مجھ سے
لے جاؤ اور میرے بچّے کو واپس لاؤ"۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ میں نے اُس کے نوکر سے کہا کہ بھاگ کر بازار جا
اور لالے کو بُلا لا۔ میں خود اس کی دکان پر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ خدشہ
تھا کہ مجرموں نے بھی دکان پر نظر رکھی ہوئی ہو گی۔ لالے کے آنے تک اس عورت
نے میرا ناک میں دم کیے رکھا۔ اُس نے ایک دو باتیں ایسی بھی کہیں جو
میں غلط سمجھا یا اُس نے بلا مقصد کہہ دی ہوں گی مثلاً اُس نے کہا —— "میرے
ساتھ ایسا دھوکہ نہیں ہو سکتا ..... مجھے یہ امید نہیں تھی"۔ —— میں نے
یہ الفاظ ذہن میں محفوظ رکھے اور کوئی جرح نہ کی۔

لالا اپنی مخصوص چال ڈھال سے آ گیا۔ بیوی اُس پر ٹوٹ پڑی
—— "تم مُردار کھانے والے مارواڑی! مجھے بتایا کیوں نہیں کہ میرے
بچّے کے انہوں نے پانچ ہزار روپے مانگے ہیں؟"

وہ تھر تھر کانپنے لگا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں
نے بھی اُسے کہا —— "بتاؤ لالہ جی! اپنی بیوی سے آپ نے اتنی خطرناک
بات کیوں چھپائی ہے؟" —— اُس کا منہ کھل گیا اور نیچے والا ہونٹ
اور زیادہ لٹک گیا۔ مجھے غصّہ آ گیا۔ میں نے کہا —— "لالہ جی مہاراج!
مجھے بتاؤ کیا ڈرامہ کھیل رہے ہو۔ سچ بتاؤ تم لڑکے کو مروانا چاہتے ہو یا
چھڑانا چاہتے ہو یا اپنی بیوی کو اپنے پاؤں میں بٹھانے کے حیلے کر رہے ہو"۔

"آپ بھی اِس کی طرفداری کرتے ہیں"۔ اس نے بھکاریوں
کی طرح کہا۔

بیوی اُس پر جھپٹ جھپٹ پڑتی تھی۔ اس دوران بھی بیوی کے منہ
سے ایک دو ایسی باتیں نکل گئیں جنہوں نے مجھے کسی اور شک میں ڈال
دیا۔ مجھے یہ واردات ایک ڈرامہ نظر آنے لگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں
تھانے بلاؤں گا۔ یہ اتنی مروّت کے قابل نہیں کہ ان کی عزت افزائی کے

لئے میں تفتیش کرنے ان کے گھر آؤں۔ بیوی سے میں نے کہا کہ وہ گھر میں رہے اور زبان بند رکھے۔ لالے سے کہا کہ وہ تھانے چلا چلے۔ اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر بولا ــــــ "حجور، میرا کاروبار ٹھپ ہو جائیگا۔"

میں نے گرج کر کہا ــــــ "فوراً تھانے پہنچو۔"

بیوی نے اُسے دھکا دے کر کہا ــــــ "سُنتا نہیں یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" بیوی نے مجھے کہا ــــــ "اسے لے جاؤ اور جیل خانے میں بند کر دو۔"

بیوی بھی غائب

میں غصّے میں جلتا بُھنتا وہاں سے نکل گیا۔ میں نے اپنا اگلا اقدام سوچ لیا تھا۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ مَیں ایک مکار ہندو کے ہاتھوں میں آلہ کار بن گیا ہوں۔ یہ جو کچھ ہے ان کے گھر کا معاملہ ہے ..... میں تھانے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ لالہ آ گیا۔ میں نے براہِ راست حملہ کیا ــــــ "سنو لالہ! پہلے آپ ملک احمد یار خان سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس شخص نے آپ کی بہت عزّت کی ہے۔ اب آپ کے سامنے داروغہ بیٹھا ہے، تھانیدار۔ سچ بتاؤ یہ کیا قصّہ ہے۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گا کیا ناٹک کھیل رہے ہو۔ لڑکے کو تم نے غائب کیا ہے یا تمہاری بیوی نے؟"

اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ پھر وہ پگڑی کے پچھلے شملے میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ میں خاموش رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے کہا ــــــ "میں تو کہتا ہوں کہ میرا بیٹا بھی مر جائے اور اس کی ماں بھی مر جائے۔ میرے پاپ کٹ جائیں گے۔ یہ نہ مرے تو شاید میں اپنے آپ کو ختم کر لوں مہاراج!" اس نے حسبِ عادت ہاتھ جوڑ دیئے اور سسکیاں لے کر بولا ــــــ "یہ کوئی ناٹک نہیں مجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔ نہ بیوی میرے بس میں ہے نہ بیٹا۔ وہ گم ہو گیا تو پانچ ہزار کا جُرمانہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔"

"مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ پانچ ہزار کے مطالبے والا رقعہ

صحیح ہے اور یہ بوگس نہیں؟"

اُس نے لمبی چوڑی جھک جھک سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ میں دراصل اُسے اس بات پر لانا چاہتا تھا کہ وہ لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ واپس لے لے اور یہ لکھ دے کہ لڑکا واپس آ گیا ہے۔ میں خطرہ مول لے رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لکھ دیتا اور دو چار روز بعد لڑکا کہیں اور قتل ہو جاتا۔ اس صورت میں یہ ذمّہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی کہ میں نے تفتیش گول کر دی تھی، ورنہ لڑکا قتل نہ ہوتا۔ یہ ہندو قوم مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیتی۔ میں چکّر میں آ گیا تھا۔ بڑی ہی پیچیدہ صورتِ حال تھی۔ میں نے یہ یقین کر لیا کہ لالہ غلط نہیں کہہ رہا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ دو تین روز مخبروں کی آنکھوں سے دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ لالے کو مَیں نے تسلّیاں اور دھمکیاں دے کر رخصت کر دیا۔ مخبروں کو نئے احکام اور نئے ٹارگٹ دیئے۔

اگلی صبح سورج کچھ اُوپر آ گیا تھا۔ لالہ پہلے سے بھی بُری حالت میں تھانے میں آیا۔ اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ میرے کمرے میں آ کر کرسی پر گر پڑا۔ اس کے مُنہ سے نکلا ــــــ "وہ بھی گئی۔"

"کون؟"

"میری بیوی۔"

"کہاں گئی؟"

"بس چلی گئی" ــــــ اُس نے کہا ــــــ "میں صبح اٹھا۔ دیکھا وہ بستر پر نہیں تھی۔ اتنی سویرے جب ابھی اندھیرا تھا، وہ کسی کے گھر تو نہیں جا سکتی تھی۔ پھر سورج نکل آیا، وہ واپس نہیں آئی۔ میں نے اس کا ٹرنک دیکھا اس کا تالا کُھلا ہُوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیسے اور زیورات اسی میں رکھتی ہے۔ میں نے ٹرنک خالی کر کے دیکھا ایک پیسہ نہیں تھا۔ زیورات بھی نہیں تھے۔ میں سمجھ گیا وہ چلی گئی ہے اور اب نہیں آئے گی۔"

"کہاں گئی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اُسی کے پاس" —— اُس نے جواب دیا۔

"اپنے بیٹے کے پاس؟"

"نہیں جی!" —— اُس نے کہا —— "اپنے بیٹے کے باپ کے پاس" —— اُس نے یہ کہہ کر مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا ——

"میں اس لڑکے کا باپ نہیں ہوں"

"وہ اُس کے پہلے خاوند کا بیٹا ہے؟"

"نہیں داروغہ جی!" —— اُس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ قصہ شروع سے سناتا ہوں۔ اب وہ چلی گئی ہے تو میں یہ قصہ سنا سکتا ہوں۔ آپ تسلی سے سن لیں۔"

اُس نے جو قصہ سنایا وہ انسان کی فطرت کے ہی ایک پہلو کی تصویر پیش کرتا ہے جو میرے لیے اور کسی بھی تھانیدار کے لیے حیران کن نہیں۔ شاید آپ کے لئے عجیب وغریب ہو۔ یہ میں اسی ہندو کی زبان سے سناتا ہوں۔ الفاظ میں کچھ ردوبدل ضرور ہوگا کیونکہ بہت پرانی بات ہے۔ واقعات صحیح ہیں۔ وہ جب مجھے یہ داستان سنا رہا تھا تو میں محسوس کر رہا تھا کہ لالے کی سب چالاکیاں اور مکاریاں جواب دے گئی ہیں۔ اُس نے بتایا:

"آڑھت کی یہ دکان میرا باپ چلاتا تھا۔ میں چودہ سال کی عمر میں دکان پر بیٹھ گیا تھا اور دو سال میں کاروبار سنبھال لیا تھا۔ میری عمر شاید سترہ اٹھارہ سال ہوگئی تھی جب میرے باپ نے ایک مسلمان منشی رکھ لیا۔ اُس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔ وہ بہت ہی خوبصورت جوان تھا۔ قد بُت اچھا اور مضبوط۔ شکل اور رنگ بہت دلکش۔ اُس کا دماغ بہت تیز تھا اور وہ لڑائی بھڑائی بھی کر لیتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ زبان کے ہیر پھیر سے کاروبار کرتے ہیں۔ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ کوئی ناراض ہو جائے تو ہاتھ جوڑ کر اُسے راضی کر لیتے ہیں، لیکن کاروبار میں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جو لٹھ بازی یا دھینگا مُشتی کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم دکانوں پر بوریاں اِدھر اُدھر

کرنے کے لئے ایسے مزدور رکھتے ہیں جو ضرورت پڑے تو ہمیں بچا لیتے ہیں اور ضرورت پڑے تو لڑ لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم ہمیشہ مسلمان منشی رکھتے ہیں۔ مسلمان ذرا دلیر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پھنسی ہوئی رقمیں نکال لاتے ہیں اور دکان پر کوئی آکر ہلّہ گلّہ کرے تو اُسے بھی سنبھال لیتے ہیں۔ ظاہری طور پر وہ حساب کتاب کا کام کرتے ہیں.....

دُلہن کا دل، دلیری اور دھونس

"میرے باپ نے جو مسلمان منشی رکھا تھا اُس میں یہ سارے وصف موجود تھے بلکہ وہ ہماری ضرورت سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اُس میں دو خوبیاں اور بھی تھیں۔ بہت اچھا گاتا تھا اور ہر بات لطیفے کے رنگ میں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل چاہتا تھا کہ اُس کی باتیں سُنے۔ وہ خوش طبیعت انسان تھا، لیکن اُس سے کوئی لڑائی مول لے بیٹھے تو اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا تھا۔ میرے باپ نے گھر کے انتظام بھی اُسی کے حوالے کر دیئے تھے۔ میں اپنے باپ کا اکیلا لڑکا تھا۔ میں دکان میں رہتا تھا۔ دو بڑی بہنیں تھیں، دونوں کی شادی ہوگئی تھی۔ گھر میں اکیلی ماں ہوتی تھی۔ باپ کاروبار میں لگا رہتا تھا۔ گھر کے سلسلے بھی منشی چلاتا تھا۔ وہ مجھ پر بھی رُعب کستا تھا۔ میں اُس سے ڈرتا بولتا نہیں تھا۔ ویسے یہ شخص مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں بائیس تیئیس سال کا ہوگیا تو میری ماں مر گئی۔ گھر میں کوئی عورت نہ رہی۔ میرے باپ نے ایک جگہ میری بات پکی کر دی اور فوراً ہی میری شادی ہوگئی.....

"میرے سسرال والے دوسری جگہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی ہمارے کاروبار اور ہماری دولت کو دی تھی۔ ہمارا کاروبار بہت ہی اچھا تھا۔ میں آج سچی بات کہنے سے نہیں ڈروں گا۔ میں نے اپنی دُلہن کو دیکھا تو میرے دل پر بوجھ پڑ گیا۔ وہ سولہ سترہ سال کی لڑکی بھی اور بہت ہی خوبصورت۔ آپ نے اسے دیکھا ہے۔ تین بچے پیدا ہوئے

ہیں۔ ایک جوان بھی ہوگیا ہے لیکن یہ عورت پہلے روز کی طرح تندرست
اور جوان ہے۔ شادی کی پہلی ملاقات پر میں نے اسے دیکھا۔ پھر میں نے
اپنے آپ کو دیکھا۔ میرا جسم اُس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ سارا دن دکان
پر بیٹھ بیٹھ کر پیٹ جوانی میں ہی بڑھ آیا تھا۔ دلہن دُبلی پتلی، گوری چٹی اور
ہنس مکھ تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ میرا باپ اسے گھر کے کام کاج اور چولہے
چوکے کے لئے لایا ہے۔ یہ باورچی خانے میں بیٹھی تو مَیلی ہو جائے
گی۔ میں تو پہلے روز ہی اس کا غلام ہوگیا۔۔۔۔

"مسلمان منشی ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ باپ نے بھی نہیں سوچا،
میں نے بھی نہیں سوچا کہ گھر میں جوان لڑکی ہے، اس لئے اب کسی جوان آدمی
کا گھر میں آنا جانا ٹھیک نہیں۔ دراصل میرے باپ کو منشی پر اعتماد تھا۔ میں نے
دیکھا کہ منشی ہمارے گھر جاتا تو بہت دیر کر کے آتا۔ اگر ہم پوچھتے تو کسی
نہ کسی دکان کا نام لے کر کہہ دیتا کہ وہاں چلا گیا تھا۔ میرا باپ تو کاروبار
میں ڈوبا رہتا تھا، مجھے کوئی اور ہی غم لگ گیا تھا۔ ایک روز منشی ہمارے
گھر گیا تو تھوڑی دیر بعد میں بھی چلا گیا۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازہ
اس طرح کبھی بند نہیں ہُوا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو بہت دیر
بعد منشی نے دروازہ کھولا۔ میں نے پوچھا کہ دروازہ کیوں بند تھا اور وہ یہاں
کیوں آیا تھا۔ منشی نے مجھے ہاتھ سے ایک طرف دھکیل کر کہا ـــــ
'چل ہٹ دھان کی بوری' ـــــ اور وہ چلا گیا۔۔۔۔

"میں نے اندر جا کر دُلہن سے پُوچھا کہ یہ بدبخت یہاں آیا تو دروازہ
کیوں بند کیا تھا؟ دُلہن نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا ـــــ 'اس
لئے بند کیا تھا کہ تم سیدھے اندر نہ آجاؤ' ـــــ ایسا کراکے کا جواب
اُس نے پہلی بار دیا تھا۔ شادی کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہُوا تھا۔ میری
زبان بند ہوگئی۔ اُس نے میرے سر پہ کھڑے ہو کر غصّے سے کہا ـــــ 'تم یہ
کہنا چاہتے ہو کہ میں کوئی بدمعاشی کر رہی تھی؟ تم دکان چھوڑ کر کیوں آئے
ہو؟ تم مجھے بدمعاش سمجھتے ہو' ـــــ وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں

نے اُس کی منتیں کیں کہ وہ نہ روئے۔ ہم لوگ کمزور دل والے ہیں۔ میں
نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے اور وعدہ کیا کہ آئندہ اس پر شک نہیں
کروں گا۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی کہلوا لیا کہ منشی کی شکایت باپ سے
نہیں کروں گا۔ میں دل میں یہ افسوس لے کر دکان پر چلا گیا کہ میں نے
دلہن کو ناراض کر دیا ہے۔ رات کو میں باپ سے چوری چھپے دُلہن کے
لئے مٹھائی لے کر گیا اور بڑی مشکل سے اُسے راضی کیا۔۔۔۔

"لوگوں کی آنکھیں اور زبانیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ مجھے محلے
کی ایک بوڑھی عورت نے ایک روز کہا ـــــ 'بیٹا! گھر کا بھی ذرا خیال
رکھا کرو۔ اس مسلمان کا گھر میں آنا بند کر دو' ـــــ پھر میرے ایک دوست
نے مجھے ایسی ہی بات کہی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں
تھی کہ بیوی اور منشی کو روکتا۔ چار مہینوں کے عرصے میں میں نے دو بار
یوں کیا کہ منشی کے پیچھے گھر گیا۔ اندر سے دروازہ بند دیکھا۔ کھٹکھٹایا تو
دروازہ منشی نے کھولا۔ میں نے دونوں بار بیوی کے آگے ہاتھ جوڑے
کہ وہ منشی کو اس طرح گھر میں نہ بٹھایا کرے۔ بیوی نے دونوں بار مجھے
ڈانٹ دیا۔ عید آئی تو میری بیوی نے منشی کو قیمتی کپڑے دیئے۔ کسی شک
کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ ایک روز بیوی نے مجھے یہاں تک کہہ دیا
ـــــ 'میں تمہاری ہی بیوی ہوں، تمہارے تمام حقوق پورے کرتی ہوں،
تمہاری خدمت کرتی ہوں۔ یہ سارے حق پورے کر کے میں جو چاہوں کروں،
تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں
آؤ گے تو میں اس آدمی کے ساتھ چلی جاؤں گی اور مسلمان ہو جاؤں گی'
ـــــ اس دھمکی نے میرے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔۔۔۔

بچّہ خاوند کا نہیں تھا

"شادی کے چھٹے مہینے میرا باپ چھ سات روز بیمار رہ کر مر گیا۔

میں جوان تھا لیکن اکیلا رہ گیا۔ ہم ہندوؤں میں بہت اتفاق ہوتا ہے۔ منڈی میں میرے باپ کی عمر کے تین چار ہندو آڑھتیوں نے میرے کاروبار کی نگرانی اور دیکھ بھال شروع کر دی۔ میرا منشی اور میری بیوی پہلے سے زیادہ آزاد ہو گئے۔ میں نے ایک روز منشی سے کہا کہ پہلے وہ میرے باپ کا نوکر تھا اب میرا نوکر ہے۔ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو اُسے نکال دیا جائے گا۔ میں نے اُسے اپنے گھر جانے سے بھی روک دیا۔ اُس نے مجھے کہا ——— 'اپنی خیریت اور اپنی بیوی کی ضرورت ہے تو مجھے روکنے اور نوکری سے نکالنے کی جرأت نہ کرنا۔ زبان بند رکھنا' ——— میں ڈر گیا اور منشی میرے گھر جاتا رہا۔ اُس نے شاید میری بیوی کو بتا دیا تھا۔ بیوی نے میرے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی۔ رات دوسرے کمرے میں سوتی اور اندر سے چٹخنی چڑھا لیتی تھی۔ دکان میں منشی میرے دماغ پر سوار رہتا تھا....

"ایک سال گزرا تو میری بیوی نے پہلے بچے کو جنم دیا۔ یہی بچہ ہے جو لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں نے بچے کو دیکھا تو مجھے ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی۔ بچہ اپنے باپ کی صحیح تصویر تھا۔ یہ میرا بچہ نہیں تھا۔ ہر ایک نقش منشی کا تھا۔ اُسے رنگ ماں کا اور شکل وصورت دونوں کی ملی تھی۔ اُس وقت تک بیوی کے ساتھ میری ناچاقی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے بچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ منشی بچے کو دیکھنے آیا۔ اُس وقت میں نے اپنی بیوی کے چہرے پر خوشی دیکھی۔ ایک روز بیوی نے مجھے صاف کہہ دیا کہ یہ بچہ تمہارا نہیں۔ میرے لئے یہ چوٹ بڑی سخت تھی۔ میں نے اُن بزرگوں کو جو میری دکان کی نگرانی کرتے تھے کہا کہ یہ منشی میرے سر چڑھ گیا ہے اور بدتمیزی کرتا ہے' اسے نکلوا دیں۔ میں نے اصل بات نہ بتائی۔ انہیں شاید معلوم ہو گا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ انہوں نے منشی کو گھیرا اور اسے کہا کہ وہ فوراً نکل جائے۔ انہوں نے اُسے غنڈہ گردی کی دھمکی بھی دی اور وہ چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ میری بیوی بھی گھر سے بھاگ جائے گی لیکن اُس نے

ایسا قدم نہ اٹھایا لیکن گھر میں میرا جینا حرام کر دیا۔ میں تو پہلے ہی اس کا غلام تھا، اب اس ڈر سے اُس کے پاؤں چھونے لگا کہ وہ بھاگ جائے گی....

"ایک رات، پہلے پہر میں نے بیوی کو کمرے سے غائب پایا۔ بچہ بھی نہیں تھا۔ میں سمجھا وہ چلی گئی ہے۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ میں نے پوچھا کہاں گئی تھی تو کہنے لگی ——— 'اس کا باپ آیا تھا' ——— میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس روز سے اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک شروع کر دیا۔ پہلے میں اس کے بُرے سلوک سے پریشان رہتا تھا اب اس کے اچھے سلوک سے پریشان ہونے لگا۔ یہ تو میں کسی وقت نہیں بھولا کہ جسم کے لحاظ سے، شکل وصورت کے لحاظ سے اور طبیعت کے لحاظ سے میں اُس کے پاؤں کی مٹی کے برابر بھی نہیں تھا، لیکن اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک شروع کر دیا جیسے میں شہزادہ ہوں۔ اس نے میرے ساتھ بیویوں والا پیار محبت بھی شروع کر دیا۔ اس سے میری عقل ماری گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مہینے میں ایک رات وہ بچے کو اٹھا کر چلی جاتی اور تین چار گھنٹوں بعد واپس آتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں جاتی ہے، لیکن وہ میرے سامنے آتی تھی تو میں جیسے مر جاتا تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں اس کا پالتو کتا بن گیا جسے گھر والے گودی میں بٹھاتے ہیں، اس کے ساتھ پیار کرتے ہیں، اس کے ساتھ کھیلتے ہیں، لیکن کتا دم ہلانے کے سوا اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا اور گھر والوں کے کسی کام میں دخل نہیں دے سکتا....

"تین چار ماہ بعد میری بیوی نے راتوں کو باہر جانا چھوڑ دیا اور وہ اُداس رہنے لگی۔ میں نے پوچھا تو نہیں، یہ سمجھ گیا کہ منشی اسے ملنے آیا کرتا تھا اب کہیں چلا گیا ہے۔ بیوی کا سلوک میرے ساتھ اچھا ہی رہا لیکن کچھ کمی آ گئی۔ میں نے اُسے روتے بھی دیکھا۔ پھر وقت گزرتا گیا۔ معلوم ہوتا تھا منشی کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دو اور بچے پیدا ہوئے۔ یہ میرے بچے تھے۔ آپ نے دونوں کو دیکھا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ

میری اولاد ہے۔ اگر آپ بڑے لڑکے کو دیکھیں تو فوراً کہہ اٹھیں گے کہ
یہ کسی اور کی اولاد ہے۔ جب میرے بچّے پیدا ہُوئے تو میری بیوی نے
انہیں کوئی پیار نہ دیا۔ اُس کا سارا پیار اپنے پہلے بچّے کے لئے تھا۔
چھوٹے بچوّں کو الگ سُلاتی اور بڑے کو اپنے ساتھ سُلاتی تھی۔ بڑے
بچّے سے مجھے نفرت تھی۔ آپ داروغہ مہاراج! بُرا نہ ماننا۔ اپنا اپنا مذہب
ہے۔ میں اس بچّے کے ساتھ کیسے پیار کر سکتا تھا جو مسلمان کا بچّہ تھا۔ وہ
سیانا ہُوا تو اس کی عادتیں مسلمانوں جیسی ہوتی گئیں۔ اُس کی ماں کے
کہنے پر میں نے اُسے سکول داخل کرایا تو پتہ چلا کہ وہ مسلمان لڑکوں کے
ساتھ کھیلتا ہے اور انہی کی طرح لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔۔۔۔

"میری بیوی نے میرے بچوّں سے پیار نہیں کیا اور میں نے اُس
کے بچّے کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہ لڑکا ماں کے لاڈ کی وجہ سے خراب
ہونے لگا۔ نویں جماعت سے اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ میں نے اسے
تین چار بار مارا پیٹا۔ اگر اکیلا میرے پاس آجاتا تو میں اسے نفرت سے دھتکار
دیتا تھا۔ سکول چھوڑ کر وہ مسلمان لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا۔
مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ گوشت بھی کھاتا ہے۔ طبیعت کے لحاظ سے بھی
وہ مسلمان ہی تھا۔ یہ شاید خون کا اثر ہے۔ اس کی ماں نام کی ہندو ہے
گھر میں رہنے سہنے اور کھانے پینے کے طریقے مسلمانوں جیسے ہیں۔"

جب تھیٹر کمپنی آئی

میں نے اسے روک دیا اور پوچھا — "آپ کس طرح یقین سے کہہ
سکتے ہیں کہ یہ لڑکا آپ کا بیٹا نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ نے اپنے
دل میں وہم بٹھا لیا ہے۔"

"اگر یہ لڑکا مل گیا تو اسے دیکھنا" — اس نے کہا — "اور اگر منشی
سامنے آگیا تو اُسے بھی دیکھنا۔ سترہ اٹھارہ سال گزر گئے ہیں منشی کا چہرہ جوان

نہیں رہا ہوگا لیکن اُسے اس لڑکے کے ساتھ کھڑا کرکے دیکھنا۔ آپ
کہیں گے کہ لڑکا اس منشی کی جوانی کی تصویر ہے۔ کوئی شک نہیں رہتا۔
میں نے منشی کا گانا سُنا ہے اور میں نے اس لڑکے کا بھی گانا سُنا ہے۔
ایک ہی جیسی آواز اور ایک ہی جیسی لَے ہے۔ جس طرح منشی دلیر اور
ہنسوڑ تھا، اسی طرح یہ لڑکا دلیر ہے اور ہنستا ہنساتا ہے۔"

اس نے باقی کہانی یوں سُنائی — "میں اس لڑکے سے اتنا ہی
ڈرتا ہوں جتنا منشی سے ڈرا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ اس لڑکے کو کس
طرح بھگاؤں۔ وہ غائب ہُوا تو میں خوش ہُوا کہ چلو میری چھٹی ہوئی لیکن
اس کی ماں نے مجھے جینے نہ دیا۔ میں نے دو دن اس کی گمشدگی کی رپورٹ
نہ کی۔ تیسرے دن بیوی کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا۔۔۔۔

"اس سے پہلے جو کچھ ہُوا وہ آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے
کہ یہاں تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ مہینے سے زیادہ یہاں رہی ہے اور
کوئی پندرہ روز گزرے کہیں آگے چلی گئی ہے۔ شاید آپ نے بھی اس کا
کوئی کھیل دیکھا ہوگا۔ میری بیوی اس مہینے کے دوران پندرہ سولہ بار
تھیٹر دیکھنے گئی اور اپنے لڑکے کو بھی ساتھ لے جاتی رہی۔ چھوٹے بچوّں
کو وہ کبھی نہیں لے گئی۔ شو رات بارہ بجے ختم ہوتا تھا اور میری بیوی دو
بجے اور کبھی اس سے بھی بعد گھر آتی تھی۔ اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔
بیوی نے میرے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے تعلق توڑ رکھا تھا۔
میں اُسے روک نہیں سکتا تھا۔۔۔۔

"ایک روز ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ تمہارا منشی اس تھیٹر کمپنی میں
ہے۔ ہر ڈرامے میں وہ گاتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ میری بیوی بار بار کیوں تھیٹر
دیکھنے جاتی ہے اور اتنی دیر سے کیوں واپس آتی ہے۔ میرے دل کو
تو بہت تکلیف ہوئی لیکن خوشی بھی ہوئی کہ لڑکا بھی گاتا ہے۔ ہو سکتا
ہے باپ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ ان دنوں میری بیوی بہت
خوش رہی۔ دو تین آدمیوں نے مجھے بتایا کہ میری بیوی تھیٹر میں فسٹ

کلاس میں بھیجتی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے کہ میں تھیٹر کیوں نہیں جاتا۔ میں یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ مجھے یہ کھیل تماشے پسند نہیں۔ پھر یہ کمپنی چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ گھر میں ماں بیٹے کے درمیان کوئی بے مزگی پیدا ہوگئی تھی۔ ماں اسے کسی کام سے روکتی تھی جسے بیٹا کرنا چاہتا تھا۔ آخر ایک صبح بیوی نے میری جان کھانی شروع کر دی کہ لڑکا کہیں غائب ہوگیا ہے۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں آپ کے پاس کس طرح اور کب پہنچا تھا....

"یہ بالکل درست ہے کہ مجھے اس لڑکے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اغوا ہُوا ہے، بھاگا ہے، قتل ہُوا ہے، میں خوش ہوں کہ میرا گھر پاک ہُوا۔ اپنی بیوی کے آگے میں اس لیے جھکا رہتا ہوں کہ میری بیوی ہے، بھاگ گئی تو میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اب پندرہ سولہ سال بعد منشی پھر سامنے آگیا ہے۔ میری بیوی بھاگ کر اُس کے پاس جا سکتی تھی اس لیے میں دبکا رہا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مجھے ایک آدمی پانچ ہزار روپے کے مطالبے اور دھمکی کا رقعہ دے گیا ہے۔ میں اُسے پہچان نہیں سکا کیونکہ اُس نے مُنہ کپڑے میں چُھپا رکھا تھا۔ میں یہ رقعہ بیوی کو نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں رقم نہیں دوں گا تو لڑکے کو قتل کر دیں گے۔ لیکن آپ نے میری خواہش پوری نہ ہونے دی۔"

"اب آپ کو کیا شک ہے کہ آپ کی بیوی کہاں گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اُسی کے پاس گئی ہوگی" ——— اُس نے جواب دیا۔

بیوی پکڑی گئی، لڑکا اغوا ہوگیا

میرے لئے اس عورت کا لاپتہ ہونا معمہ تھا۔ وہ پہلے کیوں نہ گئی؟ پانچ ہزار کے مطالبے کی سُن کر کیوں گئی؟ لڑکے کی گمشدگی پر پہلے روتی کیوں تھی؟ پھر خوش کیوں ہوتی رہی؟ اب گھبرا کیوں گئی تھی؟ ——— لالے کے

پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے اپنے متعلق تمام شکوک رفع کر دیے تھے۔ مجھے اس عورت کا تعاقب کرنا تھا۔ تھیٹر کمپنی اگلے قصبے میں چلی گئی تھی جو پچیس میل دُور تھا۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو ریلوے سٹیشن یہ معلوم کرنے کے لئے بھگایا کہ رات کی گاڑی سے کوئی عورت گئی ہے؟ رات کو لاریاں نہیں چلتی تھیں۔ گاڑیوں میں اُن دنوں کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ قصبے کے ریلوے سٹیشن سے رات بارہ بجے پسنجر ٹرین کے لئے کوئی سواری نہیں ہوتی تھی۔ میں نے لالے کو اپنے ساتھ رکھا۔

اے۔ ایس۔ آئی سٹیشن سے آگیا۔ اُس نے بکنگ کلرک سے پوچھا کہ رات کی گاڑی سے کسی عورت نے ٹکٹ خریدا تھا؟ کلرک نے بتایا کہ چادر میں چہرہ چھپائے ہوئے ایک عورت نے فلاں سٹیشن کا ٹکٹ لیا تھا۔ کلرک نے کہا کہ عورت کا ہاتھ گورا اور بہت خوبصورت تھا۔ اس نے ٹکٹ لینے کے لئے ایک ہی ہاتھ اندر کیا تھا۔ یہ اُسی قصبے کا ٹکٹ تھا جہاں تھیٹر کمپنی گئی تھی۔

کسی دوسرے شہر یا علاقے میں کہیں چھاپہ مارنے اور تفتیش کی دیگر کارروائی کرنے کا ایک سرکاری طریقہ تھا۔ میں نے سب طور طریقے بھول کر صرف ایک کانسٹیبل کو اور لالے کو ساتھ لیا اور اُسی وقت لاری میں جا بیٹھا۔ اُس زمانے میں لاری اُس وقت چلتی تھی جب بھر جاتی تھی۔ ہماری لاری کچھ دیر بعد چلی اور سُورج ڈوبنے سے بہت پہلے ہم منزل پر پہنچ گئے۔ وہاں کا تھانیدار آگرے کا رہنے والا مسلمان اور میرے دوستوں میں سے تھا۔ اُس کے پاس گئے۔ اُسے واردات سنائی اور تھیٹر کمپنی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ باہر میدان میں اس کے شامیانے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ مجھے سب انسپکٹر رضی الدین صدیقی کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ میں نے اُسے کہا ——— "اس کمپنی پر چھاپہ مارنے آیا ہوں۔ مجھے سات آٹھ کانسٹیبل دے دو اور خود بھی ساتھ چلو" ——— اُس نے ہنس کر کہا ——— "ملک! تیری کون سی کل سیدھی ہے؟"

میں نے اُسے کہا کہ یہ دفتری اور کاغذی کارروائیاں بعد میں کرلیں گے، مجھے اپنی کارروائی کرنے دو۔

وہ خود بھی ساتھ ہوگیا۔ آٹھ کانسٹیبل بھی دیئے۔ میں نے لالے اور اپنے کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور تھیئٹر کمپنی کے شامیانے پر جا بلّہ بولا۔ یہ چونکہ میدان میں تھا، اس لیے خطرہ تھا کہ پولیس کو دیکھ کر ملزم بھاگ جائیں گے۔ ہم نے بڑے اچھے طریقے سے گھیرا کیا اور اُن خیموں میں جا پہنچے جہاں ایکٹر اور ایکٹریسیں رہتی تھیں۔ ایکٹریسیں تو دو ہی تھیں، بارہ چودہ خوبصورت لڑکے تھے جنہیں رات کو لڑکیوں کے حُلیے میں اور مصنوعی بال پہنا کر نچایا جاتا تھا۔ ایک چوکور خیمے سے لالے کی بیوی اور منشی برآمد ہوئے۔ منشی کی شناخت لالے نے کی تھی۔ میں نے پہلا سوال یہ کیا ——— "لڑکا کہاں ہے؟"

"یہاں نہیں ہے" ——— منشی نے کہا۔ وہ پریشان ضرور تھا، ڈرا ہُوا نہیں تھا۔ کہنے لگا ——— "آپ نے مجھ پر کرم کیا ہے کہ خود ہی آگئے ہیں۔ میں اسی مسئلہ پر پریشان ہو رہا تھا کہ لڑکے کے متعلق پولیس کو کیا بتاؤں اور کس طرح بتاؤں۔"

میں نے وہیں بیان لینے شروع کر دیئے۔ بیان سُنانے سے پہلے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ منشی (نام بھول گیا ہوں) چالیس سال سے اُوپر کا ہوگیا تھا لیکن لالے کی بیوی کی طرح اُس کا چہرہ دھوکہ دیتا تھا۔ وہ تیس سال کا لگتا تھا۔ بارعب اور خوبرو چہرہ تھا اور قد بُت بہت موزوں۔ لالے کی بیوی اسی کے ساتھ اچھی لگتی تھی۔ ان کے سامنے لالہ ان کا نوکر لگتا تھا۔

"میرا بیان لینے سے پہلے یہ سُن لیں کہ لڑکا میرے پاس تھا" ——— منشی نے کہا ——— "چھ سات روز ہوتے اغوا ہوگیا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ میں نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں دی تو میں یہ جواب دوں گا کہ لڑکا گھر سے بھاگ کر میرے پاس آیا تھا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ لڑکا میرے پاس آکر اغوا ہُوا ہے۔ اس کی ایک

وجہ یہ لالہ مہاراج ہیں۔ لڑکا ان کا تھا۔ یہ لڑکے کی گمشدگی کو انتقام کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔"

بہرحال منشی نے رپورٹ نہ کرنے کی جو بھی وجہ بتائی وہ بے معنی تھی۔ وہ کوئی بھی وجہ بتاتا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لالے کی بیوی رو رہی تھی۔ منشی نے بتایا کہ ہمارے قصبے سے وہ اپنی تھیئٹر کمپنی یہاں لایا تو ایک روز لالے کا بیٹا اس کے پاس آگیا اور ضد کرنے لگا کہ وہ تھیئٹر میں کام کرنا چاہتا ہے۔ منشی اس تھیئٹر میں صرف ایکٹر ہی نہیں تھا حصّہ دار بھی تھا۔ اس نے لڑکے کی ضد پر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ لڑکا خوبصورت تھا اور نہایت اچھا گاتا تھا۔ اس کی آواز مرد اور عورت کی آواز کے درمیان بڑی سریلی آواز تھی۔ اُسے مصنوعی بال اور زنانہ کپڑے پہنا کر رات گیس لیمپوں کی روشنی میں سٹیج پر لایا گیا تو دیکھنے والوں نے بہت پسند کیا۔ منشی نے منادی کرادی کہ تھیئٹر میں گانے والی ایک نئی لڑکی لائی گئی ہے۔ اُس نے لڑکی کا کوئی نام بھی رکھا تھا۔ یہ "لڑکی" دو تین دنوں میں ہی مشہور ہوگئی۔ لوگ گانے سے زیادہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے تھے مگر "لڑکی" تین چار روز ہی جلوہ دکھا سکی۔

ایک رات لڑکا اپنا پارٹ ادا کرکے سٹیج سے ہٹ کر ونگ میں چلا گیا۔ اس کا اگلا پارٹ یا گانا آدھے گھنٹے بعد تھا۔ ایکٹروں وغیرہ کے لئے سٹیج سے ذرا ہٹ کر خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان خیموں سے پرے ایک اور قنات لگی ہوئی تھی۔ یہ لڑکا زنانہ لباس میں اپنے خیمے میں گیا۔ اگلے پارٹ کا وقت ہو گیا۔ لڑکا نہ آیا۔ اسے خیمے میں دیکھا، وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، وہ کہیں بھی نہ ملا۔ اس کی میز پر بڑا آئینہ رکھا تھا۔ کرسی پیچھے کو گری ہوئی تھی۔ خیمے کے دوسری طرف والے پردے رسّیوں سے بانس کے ساتھ بندھے رہتے تھے۔ دیکھا گیا کہ دوسری طرف کے پردوں کی رسّیاں چاقو سے کٹی ہوئی تھیں اور کھُلا ہُوا ایک چاقو نیچے پڑا تھا۔ لڑکے کے مردانہ کپڑے خیمے میں رکھے تھے۔ وہ زنانہ کپڑوں اور مصنوعی بالوں میں غائب ہوگیا

تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود غائب نہیں ہُوا، اغوا ہُوا ہے۔

چھاپہ اور خونریز مقابلہ

منشی نے جن ملازموں کا نام لیا ان سے الگ الگ پوچھا گیا سب نے ایک ہی جیسا بیان دیا۔ لالے کی بیوی یقین نہیں کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ منشی جھوٹ بولتا ہے۔ لڑکا اسی نے غائب کیا ہے۔ میں نے اور رضی الدّین صدیقی نے منشی اور اس کے ملازموں پر بہت جرح کی لیکن ان کے بیان میں کوئی فرق نہ آیا۔ منشی نے مجھے کہا یہ عورت (لالے کی بیوی) مجھ پر الزام عائد کرتی ہے کہ میں نے لڑکے کو غائب کر کے پانچ ہزار روپے کا مطالبہ کیا ہے میں لڑکے کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ اس لڑکے کے لئے ایک پیسہ نہ دے۔ اگر میں ایسی حرکت کرتا تو لڑکے کی ماں کو پیغام بھیجتا جس سے مجھے کچھ وصول ہو سکتا تھا۔"

منشی، لالے کی بیوی اور بیان دینے والے ملازموں کو ہم تھانے لے گئے۔ منشی مشتبہ تھا۔ رضی الدّین نے بہت مدد کی۔ رات ہو گئی تھی۔ اُس نے رات کو ہی قصبے کے چند ایک مخبر اور جرائم پیشہ آدمی بلا لیے۔ اُس وقت یہی مل سکے۔ رضی الدّین نے ان سے الگ الگ پوچھا کہ جب سے تھیٹر آیا ہے، یہاں باہر کا کون سا استاد شہر میں آیا ہے۔ یہ لوگ پولیس کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔ یہی لوگ پولیس کی آنکھیں اور کان ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی عقیدتمندی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی استاد جرائم پیشہ یا کوئی نامی گرامی ڈاکو باہر سے آتا تھا تو اسے پیروں کی طرح ملتے تھے۔ جن آدمیوں کو تھانے بلایا گیا، ان میں سے دو نے بتایا کہ مُرشد دوبارہ تھیٹر دیکھنے آیا تھا۔

"کیا وہ اُس وقت بھی آیا تھا جب نئی لڑکی آئی تھی؟"

انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی آ چکی تھی۔ مُرشد حلیہ بدل کر آیا تھا۔ ان لوگوں

کو اغوا کا دن بتا کر پوچھا گیا کہ اُس روز کسی نے مُرشد کو یہاں دیکھا تھا؟ ان لوگوں میں سے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ صبح کے وقت دو اور جرائم پیشہ بلائے گئے۔ وہ رات کو نہیں مل سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ شام کے بعد اُس نے مُرشد کو دیکھا تھا۔ بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ مُرشد تھیٹر دیکھنے آیا تھا۔ مُرشد اس علاقے کا استاد جرائم پیشہ تھا۔ اُس نے ڈاکہ زنی اور رہزنی میں نام پیدا کر رکھا تھا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ اُس کا جو علاقہ تھا وہ میرے تھانے کی بھی حدود میں آتا تھا۔ وہ دو بار سزائے قید بھی کاٹ چکا تھا۔ اب اس کا اپنا گروہ تھا۔ ہمیں مرشد کا تعاقب کرنے کے لئے خاصی شہادت اور جواز مِل گیا تھا۔ اگر لڑکا اغوا ہی ہُوا تھا تو یہ جرم مُرشد کا ہو سکتا تھا۔ وہ ایسی دلیرانہ واردات کرنے کی ہمت اور ذرائع رکھتا تھا۔

مجھے اور رضی الدّین کو تین گاؤں کا علم تھا جہاں مرشد ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے تھانے میں چلے جانا بہتر سمجھا۔ منشی اور لالے کی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ منشی ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہر لحاظ سے بےقصور ہے۔ لڑکا خود ہی اُس کے پاس آیا تھا۔ اُس نے اغوا نہیں کیا، مگر لڑکے کے اغوا کی رپورٹ پولیس کو یا وارثوں کو نہ دینا بھی جُرم تھا، اور ابھی یہ بھی ثابت نہیں ہُوا تھا کہ لڑکا مرشد ڈکیت نے ہی اغوا کیا ہے۔ منشی کو ابھی بری الذّمہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اُس نے تھیٹر بند ہونے کا خطرہ بتایا لیکن یہ کوئی جواز نہیں تھا۔ میں اُسے ساتھ لے گیا۔ منشی کو تو میں نے تھانے میں رکھا۔ لالے کی بیوی بھی تھانے میں رہنے کو کہہ رہی تھی۔ میں کسی عورت کو نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ مشتبہ بھی نہیں تھی۔ وہ لالے کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے تھانیداروں والے رعب سے تھانے سے نکالا اور لالے کے ساتھ بھیج دیا۔ اُس کی دکان کے سامنے جو مخبر مقرر کیے تھے وہ اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔

یہ اللہ کی خاص کرم نوازی تھی کہ اس کی ذاتِ مقدس نے کوئی رکاوٹ نہ آنے دی۔ میں نے ان تینوں گاؤں میں دیہاتی لباس میں تین

مخبر بھیجے جہاں مُرشد ہو سکتا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کے چوکیدار نے اطلاع دی کہ مرشد یہیں ہے۔ میں نے اُسی رات چھاپہ مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ چھاپہ مار پارٹی تیار کی۔ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک پولیس چوکی تھی جو میرے تھانے کے ماتحت تھی۔ وہاں اطلاع بھیج دی۔ چار کانسٹیبل وہاں سے لینے تھے۔ آٹھ اپنے ساتھ تھانے سے لے جانے تھے۔ راتیں چاندنی تھیں۔ میں اپنی پارٹی کے ساتھ شام کو ہی چوکی پہنچ گیا۔ چوکیدار کو اطلاع کر دی گئی۔ وہاں خطرہ یہ تھا کہ مُرشد کی سطح کے ڈاکو جس گاؤں میں رہتے تھے وہاں کے لوگ ان کے ڈر سے ان کی حفاظت کرتے تھے اور اگر انہیں قبل از وقت پولیس کی آمد کا پتہ چل جاتا تو وہ ڈاکو کو خبردار کر دیتے اور اُسے بھاگنے میں مدد دیتے تھے۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ چوکیدار ہی دھوکہ نہ دے جائے۔

میں نے چھاپے کا وقت رات کا پہلا پہر رکھا۔ اُس وقت دیہاتی گہری نیند سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ آدھی رات کے لگ بھگ آنکھ جلدی کُھل جاتی ہے.... میں نے اپنی پارٹی کو تمام ضروری ہدایات دے دیں اور انہیں بکھیر کر گاؤں میں لے گیا۔ چوکیدار باہر انتظار میں کھڑا تھا۔ اُس نے مکان بتا دیا۔ چاندنی بڑی شفاف تھی۔ میں نے کانسٹیبلوں کو مکان کے اردگرد پھیلا دیا۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں لیکن یہ ".۳۰۳" نہیں تھیں۔ رات کے وقت "بک شاٹ" رائفلیں استعمال کی جاتی تھیں۔ ان میں جو ایمونیشن استعمال ہوتا تھا اس کا ایک سکّہ (بُلٹ) نہیں بلکہ راؤنڈ میں چھرّے ہوتے تھے۔ رات کو چونکہ صحیح نشانہ نہیں لیا جا سکتا تھا، اس لیے چھرّوں سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ بھاگتے آدمی کی طرف نالی کر کے فائر کر دو تو چند ایک چھرّے اُس کے جسم میں داخل ہو ہی جاتے تھے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ملزم زندہ ہاتھ آ جاتا تھا۔

میں نے مُرشد کے دروازے پر دستک دی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ کچھ دور پیچھے ایک کانسٹیبل رائفل لیے مجھے کَور کر رہا تھا۔ میں نے

ایک بار پھر دستک دی۔ دو چار منٹ بعد دائیں طرف سے اسی مکان کی منڈیر سے مجھ پر فائر ہُوا۔ یہ شکاری بندوق کا فائر تھا۔ فائر کرنے والا ایسی جگہ تھا جہاں سے مجھے وہ نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ چھرّے میرے بالکل قریب زمین میں لگے۔ میں دروازے کے ساتھ چپک گیا۔ مجھے کَور کرنے والے کانسٹیبل نے منڈیر پر گولی چلائی۔ مجھ پر گولی چلنے کا مطلب یہ تھا کہ مُرشد کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ پولیس کے گھیرے میں ہے۔ اُس نے مقابلے کا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ چھت سے گولیاں چلنے لگیں۔ وہ چار پانچ آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میرے کانسٹیبل جوابی فائر کرنے لگے۔ میں دروازے سے ہٹ کر اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے اور اپنے کانسٹیبلوں کی پوزیشنیں دیکھنے لگا۔ پھر ساتھ والی چھت سے بھی ہم پر فائر آنے لگا۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ ہم نیچے تھے۔ دو کانسٹیبل میری ہدایت کے بغیر ہی کسی اور مکان کی چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے اُنہوں نے جو جوابی فائر کیا اس کا کچھ اثر ہوتا محسوس ہونے لگا۔

مکان کے صحن کی ایک دیوار چھ فٹ سے ذرا زیادہ اونچی تھی۔ میں نے اسے پھلانگ کر اندر جانے کا ارادہ کیا۔ میرے ایک کانسٹیبل نے مجھے روکا لیکن میں باز نہ آیا۔ میں اندر جا کر دوبدو مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اچھل کر دیوار کے اوپر ہاتھ ڈال دیا۔ کانسٹیبل سے کہا کہ مجھے نیچے سے اٹھاؤ۔ اُس نے میرے پاؤں کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے اُوپر اٹھایا۔ میرا سر اور کندھے دیوار کے اُوپر چلے گئے۔ مجھ پر بندوق فائر ہوئی۔ چھرّے زناٹے سے میرے قریب سے گزرے اور دو چھرّے میرے دائیں کندھے کی کھال کو چیرتے گزر گئے۔ میں نیچے ہو گیا۔ ذرا سا ہی فرق رہ گیا تھا ورنہ چھرّے میری کھوپڑی میں اتر جاتے۔

میرے ہیڈ کانسٹیبل امجد علی نے سب سے زیادہ جرأت کی۔ مکان سے ذرا ہی دُور پیپل کا ایک درخت تھا۔ وہ درخت پر چڑھ گیا۔ وہاں وہ چھت سے بلند ہو گیا تھا۔ ایک ٹہنی پر بیٹھ کر اُس نے چار راؤنڈ فائر

کیے۔ ایک بھی ضائع نہ ہُوا اگر ایک اور مکان سے ہیڈ کانسٹیبل پر گولی
چلی۔ اس مکان کے بچوں اور عورتوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ اس سے
نشاندہی ہوگئی کہ کون سا مکان ہے۔ میں ایک کانسٹیبل کے ساتھ دوڑتا
گیا۔ اس مکان میں داخل ہُوا اور ایک سیڑھی سے اوپر چلا گیا۔ یہ دیہات
کے کچے پکے مکان تھے۔ سیڑھی سے میں نے صرف سر اور ہاتھ اوپر کیا۔ وہاں
دو آدمی تھے۔ دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں
نے ایک پر ریوالور فائر کیا۔ وہ اٹھا اور گر پڑا۔ دوسرے نے اِدھر اُدھر
دیکھا تو میں نے گرج کر کہا —— "رائفل پھینک دو۔ دوسری گولی آتی ہے"
اُس نے رائفل پھینک دی۔ میں نے اوپر جا کر اُسے پکڑ لیا اور نیچے اتار لایا۔

گولیوں کے دھماکوں میں لڑکے کی آواز

میں پھر مُرشد کے مکان کی طرف گیا اور اُسی دیوار کی طرف چلا گیا
جہاں سے میں نے چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اندر سے ایک
آدمی دیوار پر آیا۔ میں نے اُس کی طرف ریوالور سیدھا کیا تو اُس نے مجھے
دیکھے بغیر چلانا شروع کر دیا —— "گولی نہ چلانا میں باہر آرہا ہوں" ——
میں اُس کی طرف دوڑا۔ مجھے اُس کی "اوہ مارا گیا" کی آواز سُنائی دی۔ وہ
باہر گر گرا لیکن میں نے اُسے پکڑ لیا، گرنے نہ دیا۔ اُس نے کہا —— "مجھے
گولی لگ گئی ہے" —— وہ مُرشد کا ہی آدمی ہو سکتا تھا لیکن اُس
نے اپنا نام بتایا تو میری رُوح بھی خوش ہوگئی —— وہ گمشدہ لڑکا تھا۔ اس
کی ران میں چھرّے لگے تھے۔ گوشت میں اُتر گئے تھے۔ ہڈی بچ گئی تھی۔
میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اس کے زخم پر کپڑا کس کر باندھ دو۔
مُرشد کی طرف سے فائر بند ہو گیا۔ ایک آدمی کو چھت سے کُود کر
بھاگتے پکڑا گیا۔ میں اُوپر گیا۔ مُرشد مرا پڑا تھا۔ اس کے دو ساتھی بُری
طرح زخمی تھے۔ ایک معمولی زخمی تھا۔ دوسری چھت سے دو زخمی پکڑے
ایک کو میں ایک اور چھت سے پکڑ لایا تھا۔ اس کے ساتھ والا میرے ریوالور

کی گولی سے مر چکا تھا۔ میرا نقصان یہ ہُوا کہ ایک کانسٹیبل کے پیٹ میں
چھرّوں کی بوچھاڑ چلی گئی تھی اور وہ مر گیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل جو پیپل کے درخت
پر چڑھا تھا اُسے پیچھے سے فائر کے چند ایک چھرّے بازو میں لگے تھے اور
دو چھرّے میرے کندھے کی کھال کو کاٹ گئے تھے۔

ڈاکوؤں کی لاشوں اور بیہوش زخمیوں کو چارپائیوں پر ڈال کر شہر میں
لے آیا۔ وہاں تک ایک زخمی مر چکا تھا۔ باقی سب کو اور ہیڈ کانسٹیبل کو اُسی
وقت ہسپتال بھیج دیا۔ سرکاری ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر کو جگا کر ان کی مرہم پٹی کی
گئی۔ اس گروہ کا دوسرا شدید زخمی اگلے روز مر گیا۔ لڑکے کی بھی مرہم پٹی کی
گئی۔ زخم ذرا زیادہ ہی تھا لیکن کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے علی الصبح جا کر بیان
لینے شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے لڑکے کے بیان لیے جو میں اختصار سے
پیش کرتا ہوں۔

اُس کا جب شعور بیدار ہُوا تو ماں نے اُس کے دل میں اپنے
خاوند کے خلاف نفرت ڈالنی شروع کر دی۔ لڑکا یہ تو دیکھ ہی رہا تھا کہ باپ
(لالہ) اُس کے ساتھ پیار کرتا ہے نہ بات کرتا ہے۔ اُس کے دل میں یہ
بیٹھ گئی کہ یہ اُس کا باپ نہیں۔ ماں نے اسے بے پناہ پیار دیا۔ وہ سکول
میں داخل ہُوا تو اُسے مسلمان لڑکے اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ
کھیلتا تھا۔ بڑا ہُوا تو بھی اُس نے مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھی۔ وہ
گوشت کھاتا تھا اور وہ گائے کا گوشت بھی کھا لیتا تھا۔ لالے نے اُسے
کئی بار مسلمانوں کی دوستی سے روکا۔ اُس نے لالے کو کھری کھری سُنا دیں۔
گھر میں لڑکے کی ماں لالے کو بات نہیں کرنے دیتی تھی۔ پھر یہ وقت آیا کہ
شہر میں تھیٹر کمپنی آئی۔ ایک رات ماں لڑکے کو تھیٹر دکھانے لے گئی۔
وہاں اس کی ملاقات منشی سے کرائی اور کہا کہ یہ ہے تمہارا باپ۔ لڑکا
اب جوان تھا۔ سب کچھ سمجھتا تھا۔ اُس نے ماں سے پُوچھا کہ یہ کیسے
ہو سکتا ہے؟ ماں نے اُسے بتایا کہ یہ در پردہ شادی تھی، لیکن اُس
کے ماں باپ نے اس کی شادی زبردستی اس ہندو کے ساتھ کر دی۔

اس شادی کے بعد تم پیدا ہوئے تھے۔ منشی چونکہ مسلمان تھا، اس لئے ماں اس کے ساتھ اعلانیہ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ منشی نے لڑکے سے باپ کی طرح پیار کیا اور انہیں فسٹ کلاس میں بٹھا کر کھیل دکھایا۔

لڑکا اگلے دن بھی منشی کے پاس گیا اور بہت دیر اس کے ساتھ رہا۔ اس نے منشی کو بتایا کہ وہ گاتا بھی ہے۔ اُس نے گانا سنایا تو منشی حیران رہ گیا کہ لڑکے میں اُس کے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں۔ لڑکے نے اسے کہا کہ وہ بھی تھیٹر میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ منشی نے کہا ماں اجازت دے تو آجاؤ۔ ماں نے اجازت نہ دی۔ وہ ایک بار پھر تھیٹر دیکھنے گئے تو منشی نے لڑکے کی ماں سے کہا کہ یہ تھیٹر میں شامل ہونا چاہتا ہے، اگر تم اجازت دو تو لے جاؤں۔ ماں نے کہا کہ تم مجھے پندرہ سال بعد ملے ہو۔ یہ لڑکا تمہاری نشانی ہے۔ یہ بھی چلا گیا تو میرا کیا بنے گا۔ منشی نے اسے کہا کہ تم بھی آجاؤ۔ لڑکے کی ماں نے اسے کہا کہ تھیٹر چھوڑ کر کوئی اچھا سا کاروبار شروع کر دو تو آجاؤں گی۔ لڑکے کے لئے یہ صورت ایک معمہ تھی اور تکلیف دہ بھی کہ اس کی ماں اگر اس مسلمان کی بیوی تھی تو اس لالے کے ساتھ کیوں رہتی ہے گھر سے بھاگ کیوں نہیں جاتی، لیکن ماں کے پیار نے اُسے کسی اور ہی جہان میں پہنچایا ہُوا تھا۔ اب اُس نے اپنے باپ کو دیکھ لیا تو وہ ماں سے کہنے لگا کہ لالے پر لعنت بھیجو اور اس آدمی کے ساتھ چلو۔ ماں نے نہ اسے جانے دیا نہ خود گئی۔ اس کے دل میں منشی کا جو پیار تھا وہ کم نہیں ہُوا۔ جتنے دن تھیٹر وہاں رہا ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

لڑکے کے اغوا کی داستان

پھر تھیٹر چلا گیا۔ ماں نے لڑکے کو راضی کر لیا تھا کہ وہ تھیٹر میں شامل نہیں ہوگا، لیکن لڑکے کے دل سے یہ خواہش اور ارادہ نکلا نہیں۔ ایک روز وہ اپنے دوستوں اور ماں کو بتائے بغیر رات کی گاڑی سے اگلے قصبے میں جا پہنچا اور باپ سے ملا۔ اُس نے باپ کو بتایا کہ وہ ماں کی اجازت سے

آیا ہے۔ چند روز بعد لڑکے نے باپ کو بتا دیا کہ وہ ماں کو بتا کر نہیں آیا تھا۔ باپ پریشان ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ وہ تو بے حال ہو رہی ہو گی۔ باپ نے ڈاک سے خط لکھنے کی بجائے اپنے ایک ایسے آدمی کو جو قصبے سے واقف تھا لڑکے کی ماں کے نام رُقعہ دے کر بھیجا کہ لڑکا میرے پاس ہے فکر نہ کرنا اور کسی کو بتانا بھی نہیں کہ وہ میرے پاس ہے کیونکہ لالے کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے گرفتار کرا دے گا۔ رقعہ لے جانے والے آدمی کو یہ بھی کہا گیا کہ وہ گھر جا کر لڑکے کی ماں کو رقعہ دے اور اس طرح دے کہ کوئی اور نہ دیکھ سکے — اُسے مکان اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا۔ رقعے میں منشی نے لڑکے کی ماں کو یہ بھی لکھا تھا کہ تم بھی آجاؤ، تمہاری خاطر میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اپنے بیٹے کے پاس آجاؤ۔

یہ آدمی صحیح طریقے سے صحیح ہاتھوں میں رُقعہ دے کر آگیا اور لڑکے کی ماں کا زبانی جواب لایا کہ لڑکے کی گمشدگی نے اسے جینے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا اغوا ہوگیا ہے، اِس لیے اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی تھی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ پولیس منشی کو پکڑ لے گی۔ اس عورت نے یہ بھی کہا —— "لڑکا ابھی واپس نہ آئے۔ میں ابھی گھر سے غائب نہیں ہو سکتی ورنہ پولیس مجھے پکڑ لے گی اور مجھ پر الزام آئے گا کہ میں نے خود لڑکے کو بھگایا اور پولیس کو پریشان کیا ہے۔ ذرا یہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو میں آجاؤں گی۔"

لڑکے کے اِس بیان سے اُس رقعے اور پُراسرار آدمی کا معمہ حل ہو گیا جسے میرے مخبر نے اس عورت کے گھر کے باہر پھرتے اور پھر اندر جاتے دیکھا تھا۔ میں اس کے بعد اس عورت کے گھر گیا اور دیکھا تھا کہ وہ بہت خوش تھی، لیکن یہ چھپائے رکھنے کے لئے کہ لڑکا کہاں ہے، اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس کے لڑکے کا کوئی سراغ ملا ہے یا نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ اُس روز اُس نے مجھے اپنے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلف کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید مجھے اپنے حسن کے جادو میں گرفتار کر کے لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ

گول کرانا چاہتی تھی یا مجھ سے یہ راز لینا چاہتی تھی کہ میں کیا کارروائی کر رہا ہوں۔

لڑکے نے اپنے بیان میں بتایا کہ باپ نے اُسے زنانہ کپڑے پہنا کر اور لڑکیوں کا حلیہ بنا کر سٹیج پر پیش کیا تو تماشائیوں نے داد اور تعریف چیخوں اور سیٹیوں سے کی اور جب انہوں نے گانا سُنا تو کسی کو بھی شک نہ ہُوا کہ وہ لڑکا ہے۔ اس کی آواز مَردوں جیسی بھاری نہیں اور عورتوں جیسی باریک نہیں تھی۔ لوگ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو گئے تھے۔ اگلے روز باپ نے منادی کرادی کہ تھیٹر میں نئی لڑکی آئی ہے۔ اگلی رات تھیٹر میں رش زیادہ تھا۔ تین چار راتوں بعد ایک رات وہ ڈرامے کے ایک منظر میں گانا سُنا کر اپنے خیمے میں گیا اور کرسی پر بیٹھ کر آئینہ دیکھنے لگا۔ اُس وقت تمام ملازم تھیٹر میں مصروف تھے۔ شاید پلنگ کے نیچے آدمی چھُپے ہُوئے تھے۔ اُسے اپنے پیچھے آہٹیں سنائی دیں اور فوراً ہی کسی نے اُس کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھا، پھر اسے معلوم نہیں کتنے آدمیوں نے اُسے اُٹھالیا۔ اسے ان میں سے کسی کی دھیمی سی آواز سنائی دی ——— "وہ سامنے سے نہیں اِدھر سے۔ رسیاں کاٹ دو۔ چاقو نکالو" ——— اُسے ایک بوری میں ڈال لیا گیا۔ کسی نے اسے کندھے پر ڈال لیا اور پھر اسے کہیں دُور لے جا کر گھوڑے پر رکھا گیا۔ گھوڑے زیادہ معلوم ہوتے تھے۔

انہوں نے کہیں رُک کر بوری اتاری اور دو آدمی بوری اٹھا کر چل پڑے۔ بوری کا منہ کھول کر لڑکے کو نکالا گیا۔ اس کی حالت بہت بُری ہو چکی تھی۔ اس کے تو ہوش ہی ٹھکانے نہیں آ رہے تھے۔ اسے پانی پلایا گیا۔ کمرے میں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ ایک پلنگ پر گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے ایک بارعب سا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس نے لڑکے کو اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھالیا اور اُس کے گالوں پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ——— "تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہے۔ اب تمہاری سب تکلیفیں ختم ہیں۔ اب تم رانی بنو گی۔ میں نے تمہیں تھیٹر میں دیکھا تھا۔ میں نے کسی کو کبھی دل نہیں دیا تھا۔ بہت

گانے والیاں دیکھی ہیں، لیکن تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ گھبراؤ نہیں لڑکی اب تم لوگوں کے سامنے ٹکٹ پر نہیں گاؤ گی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو خطرے میں ڈال کر تمہیں اغوا کرایا ہے۔ ان کی دلیری کی تعریف کرو۔"

وہ اسے لڑکی سمجھ کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ لڑکے نے سر سے لمبے مصنوعی بال اتار دیئے، قمیض بھی اتار کر پرے پھینک دی اور وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے ہنسنا شروع کر دیا اور پُوچھا ——— "تم نے مجھے لڑکی سمجھ کر اغوا کرایا ہے؟ شک رفع کر لو۔ میں لڑکا ہوں مَرد ہوں۔ میں زیادہ دعویٰ نہیں کرتا۔ اپنے دو آدمیوں سے کہو کہ اکٹھے میرے سامنے آکر مجھے پکڑیں اور اسی طرح بوری میں ڈالیں۔ اگر میں نے دونوں کو لڑھکا نہ دیا تو مجھے قتل کر دینا اور اگر یہ ہار گئے تو مجھے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں سے روانہ کر دینا۔"

اُس کے سامنے مُرشد بیٹھا تھا۔ وہ کھسیانہ ہو کر ہنسا اور بولا ——— "میں نے ایسا دھوکا کبھی نہیں کھایا تھا" ——— اُس نے کچھ سوچا اور کہا ——— "لیکن میں تمہیں رہا نہیں کروں گا۔ میرے آدمیوں کی اتنی زیادہ محنت ضائع نہیں جانی چاہیئے۔ میں تمہاری تعریف کرتا ہوں کہ تم ڈرے نہیں اور اغوا ہونے والوں کی طرح رہائی کی منتیں نہیں کیں۔ تم نے میرے آدمیوں کو للکارا ہے۔ میں تمہیں عزت سے رکھوں گا، لیکن کچھ وصول ضرور کروں گا۔"

اُس نے لڑکے سے باپ کا نام اور اتا پتہ پوچھا۔ لڑکے نے اپنا قصبے اور لالے کا نام بتا کر اس کی دکان کا پتہ بتا دیا۔ اگلی شام مُرشد نے اسے بتایا کہ اُس کے باپ (لالے) کو یہ پیغام دے دیا گیا ہے کہ پانچ ہزار روپیہ ادا کر دو، ورنہ لڑکے کو قتل کر دیا جائے گا۔ لڑکے کو معلوم تھا کہ لالہ ایک پیسہ نہیں دے گا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اسے مہلت مل جائے تو وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے۔ اُس نے دیکھا کہ اس کمرے میں شکاری بندوقیں اور برچھیاں رکھی تھیں۔ مکان کے دو کمرے تھے۔ وہاں ایک جوان اور خوبصورت عورت بھی تھی۔ لڑکے کو الگ کمرے میں سُلایا گیا۔ دروازہ

باہر سے بند رکھا گیا۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دوسرے دن مُرشد اپنے آدمیوں کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ لڑکے کے پاس یہ جوان عورت رہی جو بہت چالاک معلوم ہوتی تھی۔ لڑکے کو غسل خانے میں جانے کے لئے نکالا جاتا تھا۔ باہر ایک آدمی موجود تھا جو ان کمروں سے کچھ پرے ڈیوڑھی میں رہتا تھا۔ اس عورت نے لڑکے کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی جو اس حد تک بڑھی کہ اس نے لڑکے سے وعدہ کیا کہ اسے جُونہی موقع ملا وہ اسے یہاں سے نکال دیگی۔

مُسلمان کا خُون جوش میں آگیا

مُرشد دو روز بعد آگیا۔ اُس نے لڑکے کے سامنے اپنے ایک آدمی سے کہا ـــــ ”اس کے باپ کو اب بہت مہلت مِل گئی ہے۔ کل پرسوں کوئی جائے اور اس سے رقم لے آئے۔“

لڑکا پریشان ہو گیا۔ لالے سے کچھ وصول کرنا مشکل تھا۔ لڑکے کو قتل ہونا تھا۔ اُس نے مرشد سے یہ نہ کہا کہ اس کی ماں سے رقم مل سکتی ہے۔ اس نے ماں کا پتہ یہ سوچ کر نہ دیا کہ یہ لوگ ماں کو پریشان نہ کریں ..... پھر وہ رات آئی جب ایک آدمی نے اندر آ کر گھبراہٹ سے کہا ـــــ ”اُستاد، پولیس آرہی ہے۔ نکل نہیں سکو گے۔ گھیرا ہے۔“

گھر میں بہت سے آدمی تھے۔ شراب پی رہے تھے اور لڑکے سے گانا سُن رہے تھے۔ سب نے بندوقیں اٹھائیں۔ کارتوسوں کی پیٹیاں باندھیں اور ایک ایک کرکے باہر کو چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے خنجر نکال کر مرشد سے پوچھا ـــــ ”اسے ختم کر دوں؟“ ـــــ مُرشد نے کچھ سوچا۔ اُس کی داشتہ نے آگے ہو کر کہا ـــــ ”پہلے باہر کا فکر کرو۔ یہ پانچ ہزار روپیہ کیوں ضائع کرتے ہو؟ میں اسے اس پیٹی (بڑے ٹرنک) میں ڈال دیتی ہوں۔“ مُرشد نے ایک آدمی سے کہا ـــــ ”اس لڑکے کے پاس رہو۔ اگر خطرہ ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دینا۔“ ـــــ مُرشد بھی باہر کو بھاگ گیا۔ پھر لڑکے نے باہر گولیوں کے دھماکے سُنے۔ جو آدمی اس کی چوکیداری پر چھوڑا گیا تھا

اُس نے عورت سے کہا ـــــ ”میرے دوست لڑ رہے ہیں اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ رسّی لاؤ، میں اسے باندھ کر اوپر جاتا ہوں۔“ ـــــ باہر معرکہ زوروں پر تھا۔

وہ جوان عورت ایک لمبی ساری رسّی لے آئی۔ لڑکا پلنگ پر بیٹھا تھا۔ کمرے کا دروازہ کُھلا تھا۔ اس آدمی نے لڑکے کو کھڑا کرکے اس کے ہاتھ پیچھے کیے اور رسّی سے باندھ دیئے۔ رسّی کا دوسرا سرا فرش پر تھا اور لڑکے کے آگے پڑا تھا۔ وہ آدمی اسی رسّی سے لڑکے کے پاؤں بھی باندھنا چاہتا تھا۔ وہ آگے آکر بیٹھ گیا اور رسّی کا سرا پکڑا۔ لڑکے نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس آدمی کے پہلو میں اس قدر زور سے ٹھڈ مارا کہ وہ لڑھکتا ہُوا تین چار قدم پرے جا پڑا۔ اس نے اپنے پہلو کو دبایا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ لات کام کر گئی ہے۔ وہ اٹھا اور گالی دے کر عورت سے کہا ـــــ ”وہ برچھی دے مجھے“ ـــــ وہ برچھی کی طرف دوڑا جو دیوار کے ساتھ رکھی تھی۔

عورت قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ بھی برچھی کی طرف لپکی لیکن اس طرح کہ وہ اس آدمی اور برچھی کے درمیان آگئی۔ اُس نے یہ حرکت بظاہر برچھی اٹھانے کے لئے کی تھی لیکن لڑکے نے بتایا کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اس آدمی کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔ اُس نے برچھی پکڑ لی اور آدمی کو اس تک نہ پہنچنے دیا۔ اب کے اس کا پھر وہی پہلو لڑکے کے سامنے تھا جس پر وہ ایک ٹھڈ مار چکا تھا۔ اب کے لڑکے نے دو تین قدم آگے لیے اور اچھل کر دونوں پاؤں سیدھے اس آدمی کے پہلو میں مارے۔ اس نے پاؤں میں وہی زنانہ سینڈل پہن رکھے تھے جو اُس نے تھیٹر کے سٹیج پر پہنے تھے۔ لڑکا پہلو کے بل گرا اور فوراً اٹھا۔ جیسے دونوں لاتیں لگی تھیں وہ دیوار کے ساتھ لگا اور اوندھا ہو گیا۔ اُس نے سر اٹھایا تو لڑکے نے اس کے منہ پر اس طرح ٹھڈ مارا جس طرح فٹ بال کو کِک لگائی جاتی ہے۔ اِس کے بعد وہ آدمی اٹھ نہیں سکا۔

لڑکے نے عورت سے کہا ـــــ ”میرے ہاتھ کھول دو گی؟“

”کیوں نہیں کھولوں گی؟“ ـــــ عورت نے کہا اور اس کے ہاتھ کھول

دیئے۔ وہ جذباتی ہوگئی تھی جیسے لڑکے سے جُدا نہیں ہوگی، لیکن اُس نے لڑکے سے کہا ــــ "دائیں طرف کی دیوار کو د جاؤ۔ ڈیوڑھی کی طرف نہ جانا۔ دروازے کے اندر تالا لگا ہُوا ہے۔"

لڑکا باہر کو دوڑا۔ صحن کی وہی دیوار اُسے نظر آئی جس سے میں نے باہر سے اندر جانے کی کوشش کی تھی۔ لڑکے کے قد کے مطابق دیوار زیادہ اونچی تھی۔ لڑکے نے سینڈل اتار پھینکے اور تیز دوڑ کر اُچھلا تو اُس کا ایک ہاتھ دیوار کے اُوپر پہنچ گیا۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ لڑکا دیوار پر آیا اور جب وہ باہر کو کودنے لگا تو اس پر چھت سے گولی چلی جس کے بہت سارے چھرّے اس کی ران میں داخل ہو گئے۔ اُس نے باہر والوں کو یعنی ہمیں چلّا کر کہا ــــ "گولی نہ چلانا، میں باہر آرہا ہوں" ــــ اور باہر کُودا تو میں نے اسے سنبھال لیا۔

میں نے لالے اور لڑکے کی ماں کو ہسپتال بلا لیا تھا۔ ماں جس بیتابی سے اپنے بیٹے سے لپٹی اور اسے چُوما وہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے بیٹے سے الگ کیا اور تسلّی دے کر ذرا پرے بٹھا دیا تھا۔ وہ بار بار بیٹے سے پوچھتی تھی ــــ "میرے چاند! زخم میں درد ہے؟ سر دُکھتا ہے تو دباؤں؟"

میں نے اسے کہا ــــ "اِسے نہ درد ہوتا ہے، نہ اس کا سر دُکھتا ہے، یہ مسلمان کی اولاد ہے۔"

بے شک مسلمان کی یہ اولاد حلال کی نہیں تھی لیکن لڑکے کے سارے اوصاف اور غیر معمولی دلیری مسلمانوں کی تھی۔ رگوں میں باپ کا خون پُورے جوش میں تھا۔

لالہ بھی گیا

اُس کی ماں نے جو بیان دیا اُس میں اس نے تمام اُن باتوں کی تصدیق

کی جو دوسروں کے بیانات سے معلوم ہو چکی تھیں۔ اُس نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ یہ لڑکا اُس کے خاوند کا نہیں منشی کا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اُسے اپنے خاوند سے اتنی نفرت نہیں تھی۔ یہ نفرت اُس وقت پیدا ہوئی جب وہ منشی سے متأثر ہوئی۔ صرف ایک منشی سے اُسے مسلمان اور مسلمانوں کے طور طریقے اچھے لگنے لگے۔ ازدواجی زندگی کی اُس نے وہی روئیداد سنائی جو لالہ سُنا چکا تھا۔ اس نے کوئی بات نئی نہیں بتائی۔ البتہ یہ کہا کہ منشی غائب ہو گیا تو وہ سمجھی کہ اُس کی دُنیا اندھیر ہو گئی ہے۔ اس نے اس بچے کے ساتھ دل لگائے رکھا۔ پندرہ سال منشی اُس کے دل میں پہلے روز کی طرح زندہ رہا۔ پھر وہ تھیٹر کمپنی کے ساتھ اچانک آگیا۔ اُس نے اس عورت کو ایک رقعے کے ذریعے اطلاع دی تھی۔ وہ اُس کے پاس گئی تھیٹر دیکھنے کے علاوہ بھی وہ اُس کے پاس جاتی رہی۔ ان ملاقاتوں کا اس کے بیٹے کو علم نہیں تھا۔ منشی اُسے کہتا تھا کہ وہ اس کے پاس آجائے مگر وہ کہتی تھی کہ تھیٹر کو چھوڑ کر کوئی اور کاروبار کر لو۔

پھر اس کا لڑکا لاپتہ ہو گیا۔ تھیٹر کمپنی جا چکی تھی۔ وہ سمجھی کہ لڑکا اغوا ہو گیا ہے یا کسی نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ اُسے یہ شک بھی ہُوا کہ لڑکے کو اُس کے خاوند نے اغوا کرایا ہے، اسی لیے وہ تھانے رپورٹ درج کرانے نہیں جاتا۔ اس نے خاوند کو مجبور کیا کہ وہ رپورٹ درج کرائے جو اُس نے کرا دی۔ پھر اُسے منشی کا رُقعہ مِلا جس سے اسے پتہ چلا کہ لڑکا منشی کے پاس ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی لیکن وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ منشی پکڑا جائے گا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ وہ مجھے اپنے جال میں پھانس کر رپورٹ گول کرانا چاہتی تھی، لیکن میرے روّیے کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ جب اسے مجھ سے پتہ چلا کہ لڑکے کے لئے پانچ ہزار روپے کا مطالبہ آیا ہے تو وہ بہت ہی پریشان ہوئی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ منشی نے یہ چال چلی ہے اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لڑکا اغوا ہو گیا ہے۔

اُس نے نقدی اور زیورات ایک پوٹلی میں باندھے اور رات کی گاڑی سے منشی کے پاس چلی گئی۔ منشی بہت پریشان تھا۔ اُس نے جب اس عورت کو بتایا کہ لڑکا اغوا ہو گیا ہے تو اس نے یقین نہیں کیا۔ منشی نے یقین دلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے اور لڑکا برآمد ہو گیا۔ اس برآمدگی سے منشی اس عورت کے سامنے سچّا ہو گیا۔

منشی نے بھی اپنے متعلق سب کے بیانات کی تصدیق کی۔ اُس نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اُس نے پندرہ سال کی غیر حاضری کے متعلّق بتایا کہ اُسے جب لالے نے دکان سے نکلوا دیا تو وہ چند مہینے قریب کے ایک شہر میں رہا۔ مہینے میں ایک بار اپنے بچّے اور اس کی ماں سے ملنے آتا رہا۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہُوا کہ کلکتہ چلا گیا۔ وہاں سے بمبئی گیا۔ بمبئی میں اُسے ایک آدمی ملا جو تھیٹر کمپنی بنا رہا تھا۔ منشی اُس کے ساتھ مِل گیا۔ وہ اچھا ایکٹر اور بہت اچھا گوّیا تھا۔ وہ ہوشیار بھی تھا۔ اسے کمپنی میں مالکانہ حصّہ مِل گیا۔ اُس کی کمپنی سارے ہندوستان میں گھومتی پھرتی اس قصبے میں آئی اور اُس کی ملاقات اس عورت اور اپنے بچّے سے ہوئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ یہ عورت اسے ملے گی لیکن وہ اسے پہلے کی طرح چاہتی تھی۔

کیس عدالت میں گیا تو مُرشد کے زندہ ساتھیوں کو اغوا، مقابلے اور ایک کانسٹیبل کے قتل کے جرم میں مختلف دفعات میں پانچ سال سے عمر قید تک سزائیں سنائی گئیں۔

یہ واردات منشی اور لڑکے کی ماں کے لئے باعثِ برکت ثابت ہوئی۔ ماں لڑکے کے ساتھ منشی کے پاس چلی گئی اور مسلمان ہو گئی۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ لالہ گھر میں مَرا پڑا ہے۔ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔

★ ★

رومال، رنگ اور رگوناتھ

لاش ننگی چارپائی پر لائی گئی۔ پُرانی سی ایک چادر نے لاش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اُس وقت تھانے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے میرے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا —— ”ملک صاحب! ایک اور آ رہی ہے“ —— اُس کے لہجے اور انداز میں ایسی خوشی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ایک اور ناچنے گانے والی آ رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ایک لاش آ رہی ہے۔ پولیس اور پوسٹ مارٹم کرنے والوں کے لیے لاش کوئی عجوبہ نہیں ہوتی۔ لاش، قتل اور پھانسی کے الفاظ پولیس کے ہاں اس طرح بولے جاتے ہیں جس طرح آپ ہر روز دھنیا، پیاز اور ٹماٹر کہتے ہیں۔ آج اتنی مدّت بعد مجھے یہ واردات یاد آئی تو میرے کانوں میں ہیڈ کانسٹیبل کی آواز گونج اٹھی —— ”ملک صاحب! ایک اور آ رہی ہے“ —— میں آپ کو اپنی تفتیش کی یہ روئیداد اور واردات کی کہانی اسی فقرے سے شروع کر کے سُناتا ہوں —— ”یہ لو پڑھنے سننے والو، ایک اور آ رہی ہے —— سٹوری!“

اُس دور کی بھیانک وارداتیں آج دلچسپ کہانیاں بن گئی ہیں۔

ہیڈ کانسٹیبل کی آواز پر میں کُرسی سے اٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا برآمدے میں آیا۔ چارپائی تھانے کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ چار آدمیوں نے اُٹھا رکھی تھی۔ اِن میں دو ادھیڑ عمر دیہاتی تھے اور دو نوجوان شہری۔

چارپائی کے ساتھ ساتھ ایک اور شہری نوجوان چلا آرہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بارہ بور کی ایک نالی بندوق تھی۔ اس لڑکے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے یاد دلایا کہ دھرم چند کا بیٹا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ یہ نام دھرم چند تھا۔ اس وقت جو نام ذہن میں آتا ہے لکھ ڈالتا ہوں۔ آپ کی دلچسپی ناموں سے نہیں کہانی سے ہے۔ چارپائی ابھی دس بارہ قدم دُور ہی تھی جب ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا ——

"اوے مر گیا ہے یا ابھی زندہ ہے؟"

"مرا ہُوا ہے" —— جواب ملا۔

چارپائی برآمدے میں رکھ کر چاروں ہانپتے کانپتے الگ ہو بیٹھے اور پسینہ پونچھنے لگے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی تو ایک خُوبرو نوجوان چہرہ نظر آیا۔ آنکھیں بند، منہ ذرا سا کھُلا ہُوا۔ چہرے پر درد کا آخری تاثر نقش ہو گیا تھا۔ پھر بھی چہرے کا حُسن سلامت تھا مگر جسم سے جان نکل چکی تھی۔ وہ شہر کا رہنے والا تھا۔ چادر پوری ہٹائی تو قمیض اور پتلون خون سے لال تھی۔ زخم دائیں پہلو میں تھا۔ وہاں سے قمیض پھٹی ہوئی تھی —— مجھے وہاں گوشت کے ذرّے اور لوتھڑے نظر آئے۔ قمیض ہٹا کر دیکھا۔ وہاں سے پیٹ پھٹا ہُوا تھا۔ زخم کلہاڑی، چاقو یا برچھی کا نہیں تھا۔

میرے سامنے چارپائی کے دوسری طرف بندوق والا نوجوان کھڑا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے تھتھیا کر کہا —— "ہم اکٹھے شکار کھیلنے گئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ اُونچی اُونچی گھاس میں پیشاب کرنے بیٹھا ہُوا ہے۔ مینڈھ پر ایک فاختہ آن بیٹھی۔ میں نے اُس پر گولی چلائی۔ فاختہ مر گئی لیکن مجھے ایک چیخ سُنائی دی۔ یہ اُٹھا اور گر پڑا۔ جا کر دیکھا تو یہ مر چکا تھا۔ کارتوس کے بہت سارے چھرّے اس کے پیٹ میں جا لگے۔ یہ میرا بہت ہی گہرا دوست تھا، مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چھرّوں کے راستے میں یہ بیٹھا ہے۔"

دوسرے دو شہری نوجوان بھی ان کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔ اُنہوں نے بھی بندوق والے کی تائید کی اور کہا کہ اسے اتفاقیہ گولی لگی ہے۔ اِن میں ایک ہندو اور ایک مسلمان تھا۔ دونوں دیہاتیوں نے بتایا کہ ہندو لڑکا بھاگا ہُوا اُن کے گاؤں آیا جو موقعۂ واردات سے ایک میل یا ذرا کم تھا۔ اُس نے وہاں بتایا کہ اُن کا ایک دوست اتفاقیہ گولی لگنے سے مر گیا ہے۔ اس کی لاش شہر تک لے جانی ہے۔ چار آدمی ایک چارپائی اُٹھا کر اُس کے ساتھ گئے۔ لاش چارپائی پر ڈالی۔ ایک طرف سے دو لڑکوں نے اُٹھائی، دوسری طرف دو دیہاتی ہو گئے۔ اس طرح چار کی بجائے یہ دو دیہاتی ساتھ آئے۔ اِن میں ایک کچھ سیانا تھا۔ لڑکے لاش اُس کے گھر لے جانا چاہتے تھے۔ اِس دیہاتی نے کہا کہ اِس طرح وہ پھنس جائیں گے۔ لاش تھانے لے چلیں تاکہ پولیس کے کاغذوں میں لکھ دیا جائے کہ یہ حادثہ ہے۔

میں نے مرنے والے کے گھر کا اتا پتہ لڑکوں سے معلوم کر کے اُس کے لواحقین کو اطلاع بھجوا دی اور پوسٹ مارٹم کے کاغذات تیار کرنے کے لیے کہا۔ پولیس کے ہاں یہ رواج شروع سے چلا آرہا ہے کہ کوئی واردات آجائے تو یہی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ رجسٹر نہ کی جائے۔ اس میں اپنے فرائض سے انحراف بھی ہوتا ہے اور تفتیش کے چکّر سے بچنے کی کوشش بھی۔ کیس رجسٹر کرنے کے لیے (جسے ہمارے ہاں پرچہ چاک کرنا کہتے ہیں) بعض تھانیدار رشوت بھی لیتے ہیں اور بعض تھانیدار رپورٹ درج کرانے والے کو ہی کہتے ہیں کہ وہ خود تفتیش کر کے اصل مجرم کی نشاندہی کرے۔ انگریزوں کی حکومت میں بھی تھانوں میں یہ رویّہ اختیار کیا جاتا تھا لیکن بہت کم۔ پاکستان میں یہ رویّہ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ مجرموں کو کھُلی چھٹی مل گئی ہے۔

حادثاتی موت یا خودکشی کے کیسوں میں تو تھانیداروں کی یہی کوشش رہی ہے کہ رسمی سی کارروائی کر کے اسے حادثہ یا خودکشی

لکھ دیتے ہیں۔ اگر کوئی تھانیدار کسی کی شکایت کے بغیر اس وہم میں پڑ جائے کہ یہ موت اتفاقیہ نہیں بلکہ قتل کی واردات ہو سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تفتیش کے بڑے لمبے چکّر میں پڑ جاتا ہے۔ میں نے بھی جب تین زبانوں (گولی چلانے والے اور اس کے دو دوست) سے سُنا کہ گولی اتفاقیہ لگی ہے تو مجھے اطمینان ہُوا کہ یہ قتل نہیں اور میں ایک تفتیش سے بچا۔ دیہاتیوں کو چونکہ حادثے کا علم نہیں تھا، وہ تو صرف لاش اُٹھا کر لائے تھے، اس لیے میں نے اُن سے مختصر سے بیان لیے دوسرے لڑکوں سے بھی بیان لئے اور ذہن میں اتفاقیہ موت رکھ کر سوال وجواب کئے۔ اس سے پہلے ایسے دو حادثے میرے سامنے آچکے تھے۔ اناڑی شکاری بندوق لے کر شکار کو گئے اور اپنے ایک ساتھی کو مار لاتے۔

میں دفتر میں بیٹھا بیان لکھ رہا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی جانے والی تھی۔ اچانک باہر سے چیخیں اور دھاڑیں سُنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ متوفی کے لواحقین آ گئے ہیں۔ میں باہر نکلا۔ متوفی کا باپ، بڑا بھائی، ماں اور ایک جوان بہن آ گئی تھی۔ اتنے خوبرو جوان کی موت ماؤں اور بہنوں کو پاگل کر دیا کرتی ہے یہی حالت اس کی ماں اور بہن کی ہو رہی تھی۔ باپ اور بھائی کی دھاڑیں آسمان کو ہلا رہی تھیں۔

پولیس والوں پر جن کے پاس لہولہان لاشیں آتی ہیں، اُس ڈاکٹر پر جو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے چیرتا پھاڑتا ہے اور جیل والوں پر جو پھانسی دے کر لاشیں لواحقین کے حوالے کرتے ہیں، ماؤں بہنوں کے بین اور باپوں کی دھاڑیں کوئی اثر نہیں کرتیں۔ وہ عادی ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ جذبات سے مغلوب ہو جائیں تو نوکری چھوڑ دیں۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے، جذبات کے آگے پہاڑ کھڑے نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے ارد گرد تھانیداری کے جو پہاڑ کھڑے کر رکھے تھے وہ گر پڑے اس ہندو نوجوان پر مجھے غصّہ آ گیا جس نے اندھا دھند بندوق چلائی اور اپنے

جیسا ایک نوجوان مار ڈالا تھا۔ ہندوؤں نے کب بندوق چلائی تھی۔ یہ بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا جو آڑھتی بھی تھا۔ ذات کا راجپوت تھا، اس لئے گھر میں بندوق بھی رکھ لی تھی مگر چلانے کا پتہ نہ تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں دفتر چلا گیا۔ بندوق چلانے والا جس کا نام رگھوناتھ قسم کا تھا، اندر بیٹھا تھا۔ میں نے ایک سانس میں اُسے آدھی درجن گالیاں دے ڈالیں اور کاغذی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے چلی گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے تک میں ان تینوں لڑکوں اور دونوں دیہاتیوں کو چھوڑ نہیں سکتا تھا یا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر بعد اُنہیں برآمدے میں بیٹھنے کو کہا۔

پوسٹ مارٹم کا انتظام شہر کے ہسپتال میں تھا۔ یہ شہر نہیں قصبہ تھا جہاں ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ اس میں ایک سرکاری ڈاکٹر تھا جسے سِول سرجن کہتے تھے۔ باریک معائنے کے لیے ہمیں ضلعی شہر کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ عام پوسٹ مارٹم وہیں، سِول ہسپتال میں ہو جاتا تھا۔ باہر رونا بند ہو چکا تھا۔ متوفی کے لواحقین لاش کے ساتھ ہسپتال چلے گئے تھے۔ میں دفتر سے نکلا تو تھانے کے گیٹ میں متوفی کی بہن داخل ہوتی نظر آئی۔ اُسے میں نے لاش پر گرتے اور اپنے بال نوچتے دیکھا تھا۔ وہ جوان لڑکی تھی اور اپنے بھائی کی طرح خوبصورت۔ اُس نے برقعے کی بجائے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ بہت تیز چل رہی تھی۔ میرے پاس آ کر بولی ——— "ذرا اندر چلیں۔"

میں اُس کے ساتھ اپنے دفتر میں گیا۔ اُس کی آنکھیں سوجنے لگی تھیں۔ میں نے اُسے بٹھایا اور ایک کانسٹیبل کو پانی لانے کو کہا۔

"میرے بھائی کو قتل کیا گیا ہے" ——— اُس نے کہا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔

میں یوں ہِل گیا جیسے اُس نے میرے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے

تارلگا دیئے ہوں۔ وہ خاموش ہو چکی تھی مگر میرے ذہن میں ایک پہیّہ بہت تیز چل پڑا۔ ایک ہی بار قتل کی کئی وجوہات میرے ذہن میں آگئیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ قتل کا باعث یہی لڑکی ہوگی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس لڑکی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔

"اِس کافر نے جان بُوجھ کر میرے بھائی کو گولی ماری ہے" ——— اُس نے کہا۔

"گولی مارنے کی وجہ؟" ——— میں نے پُوچھا ——— "تمہارے ابا جان اور بھائی بھی یہاں آئے تھے۔ اُنہوں نے اس شک کا اظہار نہیں کیا۔"

"انہیں معلوم نہیں" ——— لڑکی نے کہا ——— "میں انہیں بتانا بھی نہیں چاہتی۔ میں ہسپتال سے آئی ہوں۔ انہیں یہ کہہ کر آئی ہوں کہ گھر جا رہی ہوں۔ باہر تالا نہیں لگایا تھا۔"

"تم اتنے یقین سے بات کر رہی ہو جیسے تمہارے پاس قتل کا ثبوت موجود ہے۔"

"یہ ثابت کرنا آپ کا کام ہے" ——— اُس نے کہا ——— "آپ چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے دل کی بات بتا رہی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ رگھوناتھ (گولی چلانے والے) کی بہن میرے بھائی (محسن) کو اتنا زیادہ چاہتی تھی کہ اس کے لیے مذہب تک چھوڑنے کو تیار تھی۔ محسن (متوفی) بھی اُسے اسی طرح چاہتا تھا۔ رگھوناتھ کی بہن میری سہیلی ہے۔ وہ شاید محسن کی خاطر ہی میری سہیلی بنی تھی۔ دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتی تھی۔ محسن بھی تھوڑی دیر کے لیے ہمارے پاس بیٹھتا تھا۔ ہر بہن کو اپنے بھائی کے ساتھ محبّت ہوتی ہے۔ لیکن محسن کے ساتھ میری محبّت کچھ اور تھی۔ عجیب سی بے تکلفی تھی۔ اُس نے مجھے اس راز میں بھی شریک کر لیا تھا کہ وہ اس ہندو لڑکی کو بُری طرح چاہتا ہے اور یہ لڑکی اُس کی خاطر مذہب بھی چھوڑنے کو تیار ہے۔

لڑکی نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ محسن کے ساتھ ہی شادی کرے گی۔ گھر سے بھاگنا پڑا تو محسن کے ساتھ بھاگے گی۔ محسن نے حوصلہ قائم رکھا تو وہ اعلانیہ مذہب چھوڑ کر ہمارے گھر آجائے گی۔ میں اُن کی محبّت میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ محبّت نے اُنہیں پاگل کر رکھا ہے۔"

"وہ باہر بھی ملتے ہوں گے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"ہاں" ——— اُس نے جواب دیا" ——— محسن نے مجھے بتایا تھا کہ کبھی کبھی باہر بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"تم غالباً یہ کہنا چاہتی ہو کہ رگھوناتھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ محسن کے تعلقات اس کی بہن کے ساتھ ہیں" ——— میں نے کہا ——— "اور رگھوناتھ نے محسن کو دانستہ گولی مار کر کہہ دیا ہے کہ گولی اتفاقیہ لگی ہے۔"

"بالکل یہی" ——— اُس نے کہا ——— "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ ایسا ہُوا ہے۔ میں اس شک پر بات کر رہی ہوں کہ اس عمر میں لڑکے لڑکیاں جذبات سے اندھے ہو کر احتیاط نہیں کرتے۔ ان کی ملاقاتیں چونکہ باہر بھی ہوتی تھیں، اس لیے یہ ممکن ہے کہ رگھوناتھ کو علم ہو گیا ہو۔ آپ شاید جانتے ہوں گے کہ رگھوناتھ کا باپ زمیندار اور آڑھتی ہے اور یہ خاندان دوسرے ہندوؤں سے مختلف ہے۔ دوسرے ہندوؤں میں قتل کی جرأت نہیں ہوتی۔"

لڑکی خاصی ذہین اور وسیع دماغ والی معلوم ہوتی تھی۔ اُس میں پردے میں بیٹھی رہنے والی لڑکیوں والی جھجک نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کا جوان بھائی قتل ہو گیا تھا اور دوسری یہ کہ وہ کھاتے پیتے خاندان کی اور صاحبِ حیثیت باپ کی بیٹی تھی۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ محسن نے کبھی اُس کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ رگھوناتھ کو اپنی بہن اور محسن کے تعلقات کا علم ہو گیا ہے؟ اُس نے کہا کہ محسن نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے والدین کو معلوم نہیں کہ محسن اور اس ہندو

لڑکی کا دوستانہ ہے۔

"میں مان نہیں سکتی کہ رگھو ناتھ کو علم نہ ہُوا ہو" ——— اُس نے کہا۔

"تم یہ بات شک کی بنا پر کہہ رہی ہو۔"

"جی ہاں!" ——— اُس نے کہا ——— "یہ میرا شک ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ اس میں دلچسپی لیں گے یا نہیں۔ اگر آپ نے اسے صرف حادثہ لکھ دیا تو......" اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس نے نیچے والا ہونٹ دانتوں میں لے لیا اور اچانک سر میز پر مار کر اس بُری طرح روئی کہ میرا سینہ ہل گیا۔ مَیں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تسلّی دلاسہ دیا اور کہا ——— "میں پُوری دلچسپی لوں گا۔ اسے حادثہ نہیں لکھوں گا۔"

اُس نے جس طرح اچانک سر میز پر پھینکا تھا اسی طرح اچانک سر اٹھایا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہچکیاں رُک گئیں۔ اُس نے دانت پیس کر کہا ——— "اگر آپ نے اس کافر کو حادثہ کہہ کر رِہا کر دیا تو کل ہی اُس کی لاش اس تھانے میں آئے گی اور مجھے آپ زندہ نہیں پکڑ سکیں گے۔ آپ کو میری لاش ملے گی۔ ابھی کہہ کر دیکھ لیں کہ یہ موت اتفاقیہ ہے۔ رگھو ناتھ باہر بیٹھا ہے۔ اُسے مجھ سے چُھڑا لینا۔"

میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکا کہ اُس وقت لڑکی کی جذباتی حالت کیسی ہو گئی تھی۔ اگر میں اُس کی مرضی کے خلاف بات کرتا تو وہ شاید میرا بھی منہ نوچ لیتی۔ اُس کے جذبات ایک بہن کے جذبات تھے، لیکن میں اُسے ایک مسلمان لڑکی سمجھنے لگا جس میں غیرت اور انتقام کا جذبہ اُمڈ آیا تھا۔ اُس کے بھائی کو ایک ہندو نے قتل کر دیا تھا۔ اُس نے مجھ میں ایک بھائی کے اور ایک مسلمان کے جذبات بیدار کر دیئے۔ بات شک کی تھی، لیکن مجھے قانون نے یہ حق دے رکھا تھا کہ میں نے موقعۂ واردات کا معائنہ کر کے اور واردات یا حادثے کے احوال و کوائف کا جائزہ لے کر رائے قائم کروں کہ یہ قتل ہے یا اتفاقیہ موت۔ میں نے پوری تحقیقات

کا فیصلہ کر لیا اور لڑکی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے کہا کہ وہ چلی جائے۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار نہ کیا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو بُلا کر تین چار کانسٹیبل ساتھ لینے اور گھوڑا لانے کو کہا۔ اُسے بتایا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں دیہاتیوں اور تینوں لڑکوں کو کانسٹیبلوں کے ساتھ موقعۂ واردات کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جگہ کوئی اڑھائی تین میل دُور بتائی گئی تھی۔ میں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

میرے ذہن میں رگھو ناتھ کی بہن تھی، لیکن میں ابھی کسی کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں تفتیش کس بنیاد پر کر رہا ہوں۔ راستے میں ہی لڑکوں سے جا ملا۔ پہلے مسلمان لڑکے کو بلایا اور دوسروں سے الگ ہٹا کر اُس سے پوچھتا گیا۔ رگھو ناتھ نے کہا تھا کہ محسن پیشاب کرنے گیا تھا۔ دوسرے لڑکوں (ہندو اور مسلمان) نے بھی تائید کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ محسن نے خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے اس مسلمان لڑکے سے پوچھا کہ محسن کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا یا بیٹھ کر۔ وہ کچھ گھبرایا۔ میں نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے پتلون پہن رکھی تھی۔

"وہ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا" ——— لڑکے نے جواب دیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ اُسے یقین نہیں کہ اس کا جواب صحیح ہے یا غلط۔

"فاختہ مر گئی تھی؟" ——— میں نے پُوچھا۔

"جی ہاں!"

چند اور باتیں معلوم کر کے میں نے رگھو ناتھ کے ہندو دوست کو بُلایا۔ اُس سے بھی یہی سوال پُوچھے۔ اُس نے بھی یہی جواب دیئے جو اُس کا مسلمان دوست دے چکا تھا۔ انداز اُس کا بھی گھبراہٹ والا تھا۔ فاختہ کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس نے نہیں دیکھی کہ مری تھی یا

نہیں۔ دونوں نے بتایا کہ جب رگھوناتھ نے گولی چلائی وہ وہیں تھے اور انہوں نے اُسے گولی چلاتے دیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر دونوں نے بتایا کہ محسن نظر نہیں آرہا تھا، حالانکہ دونوں کہہ چکے تھے کہ محسن کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا۔

ہم عام رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ میں ان لڑکوں سے کچھ اور پُوچھنا چاہتا تھا۔ کچھ معلومات دیہاتیوں سے لینی تھیں۔ میں نے تھانے میں اُن سے زیادہ گہری پُوچھ گچھ نہیں کی تھی کیونکہ اُس وقت میں اسے حادثاتی موت سمجھ رہا تھا۔ اب میری تفتیش کی لائن بدل گئی تھی، لہٰذا میں بال کی کھال اتارنے لگا تھا۔ مجھے موقعہ نہ ملا کیونکہ پیچھے سے کوئی مجھے بُلا رہا تھا۔ میں نے "ملک صاحب۔ ملک صاحب" کی پکار پر پیچھے دیکھا۔ پانچ چھ ہندو دوڑے چلے آرہے تھے۔ انہیں حادثے کی اطلاع دیر سے ملی تھی۔ میں رُک گیا۔ کانسٹیبل سے کہا کہ ان سب کو لے چلو۔

ہندو میرے قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ محسن کا باپ بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ان ہندوؤں میں رگھوناتھ کا باپ بھی تھا۔ میں گھوڑے سے اُترا۔ رگھوناتھ کا باپ مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا۔ یہ اُس کی خوشامد کا مظاہرہ تھا۔ دوسرے بھی اس طرح جُھک کر ملے جیسے میں تھانیدار نہیں انگریز ڈپٹی کمشنر ہوں۔

"مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ یہ حادثہ ہو گیا ہے" —— رگھوناتھ کے باپ نے کہا —— "اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ بیچارے محسن کو اتفاقیہ گولی لگی ہے۔ ہم تھانے گئے۔ معلوم ہؤا آپ اِدھر آگئے ہیں ہسپتال گئے۔ اِن سے (محسن کے باپ سے) ملے۔ یہ بیچارے کہتے ہیں کہ میرا بیٹا تقدیر سے اتفاقیہ مارا گیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ رگھوناتھ مر جاتا محسن نہ مرتا" ایسی بہت سی باتیں کر کے اُس نے کہا "اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"موقعہ واردات کا معائنہ ضروری ہے" —— میں نے کہا۔

"آپ ان لڑکوں کو کب فارغ کریں گے؟" —— اُس نے کہا —— "یہ تو حادثہ ہے۔ تحقیقات کی کیا ضرورت ہے" —— اُس نے محسن کے باپ سے کہا —— "کیوں جی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ملک صاحب! میں کوئی شکایت نہیں کروں گا" —— محسن کے باپ نے کہا —— "نہ میری کوئی رپورٹ ہے۔ میں نے قبول کر لیا ہے کہ میرا بیٹا اتفاقیہ مر گیا ہے۔"

"جی۔ جی" —— ایک اور ہندو نے کہا —— "وہ تو گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے دشمن تو نہیں تھے۔ یہ صاحب کوئی رپورٹ ہی نہیں کر رہے تو آپ اپنی کارروائی روک دیں۔"

میں چونکہ خاموش تھا اس لیے وہ مجھے مشورے اور ہدایات دیتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے محسن کے باپ کو دیکھا۔ اُسے میں نے چند گھنٹے پہلے تھانے میں بھی دیکھا تھا جب وہ بیٹے کی لاش دیکھنے آیا تھا۔ ان چند گھنٹوں میں وہ آدھا رہ گیا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ میں جان گیا کہ یہ ہندو اسے بہلا پھسلا اور ورغلا کر یہ کہلوانے کے لیے ساتھ لائے ہیں کہ اُسے کوئی شکایت نہیں۔ ہندو کی خود غرضی، مطلب پرستی اور مُسلم دشمنی کو میں خوب جانتا تھا۔ ضرورت پڑے تو ادنیٰ درجے کے مسلمان کے بھی پاؤں میں سر رکھ دیتے اور وقت پڑے تو گردن پر چھُری رکھ دیتے تھے۔ مجھے غصّہ آگیا لیکن اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

"آپ مجھے کارروائی سے نہ روکیں" —— میں نے تحمّل سے کہا —— "میں یہی دیکھنے جا رہا ہوں کہ یہ موت اتفاقیہ واقع ہوئی ہے۔ مجھے کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ اُوپر والوں کو رپورٹ دینی ہے۔ میں تھانے میں بیٹھے بیٹھے یا آپ کے مشوروں پر عمل کر کے تو کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ یہ تو لڑکے بھی مجھے بتا چکے ہیں کہ گولی اتفاقیہ لگی ہے۔"

"چلیے۔ ہم بھی ساتھ چلتے ہیں" —— رگھوناتھ کے باپ نے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ نہیں سے واپس تشریف لے جائیں"۔ میں نے کہا اور محسن کے باپ کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ "آپ انہیں اپنے ساتھ نہ گھسیٹیں۔ یہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ انہیں اور بھی کچھ انتظامات کرنے ہیں۔"

ہندوؤں نے چاپلوسی کے انداز میں میرے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو میں نے نہایت بُردباری سے انہیں واپس جانے کو کہا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر انہوں نے ضد جاری رکھی تو میں تینوں لڑکوں کو حوالات میں بند کر کے تفتیش کروں گا۔ اِس دھمکی سے وہ ٹل گئے۔

موقعۂ واردات پر میں اِن لڑکوں کی رہنمائی میں پہنچا۔ رگھوناتھ کو اپنے ساتھ رکھا اور باقی سب کو دُور بھیج دیا۔ اس سے پوچھا کہ اُس نے گولی کہاں سے چلائی تھی۔ وہ تین چار قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "یہاں سے"۔ پھر میں نے پُوچھا کہ فاختہ کہاں تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلا اور کوئی چالیس قدم دُور ایک مینڈھ پر پاؤں رکھ کر کہا ـــــ "یہاں"۔

"فاختہ مر گئی تھی؟"

"جی ہاں"

"تم نے اٹھائی تھی؟"

"جی ہاں"

"تم نے محسن کی چیخ فاختہ اٹھانے سے پہلے سُنی تھی یا بعد میں؟" ـــــ میں نے پوچھا اور کہا ـــــ "میں تمہیں یاد کرا دوں کہ تم نے تھانے میں مجھے بتایا تھا تو تمہیں چیخ سُنائی دی تھی محسن گھاس کے پیچھے سے اٹھا اور گر پڑا۔"

"میں نے دوڑ کر فاختہ اٹھائی" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "پھر محسن کو دیکھا۔"

"تم نے دوست کو اٹھانے سے پہلے فاختہ کو اٹھانا زیادہ ضروری سمجھا" ـــــ میں نے کہا۔

یہ نوجوان ہندو راجپوت عقلمند بھی لگتا تھا اور دلیر بھی لیکن قتل جیسے جرم کے لیے جس عقل کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی پیشہ ور قاتل میں ہی ہو سکتی ہے۔ رگھوناتھ نے منہ کھول کر مجھے دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

"گھبراؤ نہیں بھائی! تم شکاری ہو" ـــــ میں نے کہا "شکاری کو شکار کے ساتھ جو دلچسپی ہوتی ہے وہ دوست کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔"

میں نے اس واردات کو قتل کہہ دیا ہے۔ میرا شک پختہ ہو گیا تھا کہ یہ موت اتفاقیہ یا حادثاتی نہیں۔ رگھوناتھ نے فاختہ کی جو جگہ مجھے دکھائی وہاں کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے پتہ چلتا کہ یہاں ایک فاختہ بارہ بور کے کارتوس کے چھرّوں سے مری ہے۔ وہاں دو تین چھوٹے پَر ہونے چاہئیں تھے۔ ذرا سا خون ہوتا۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو چھرّے زمین پر بھی لگے ہوتے۔ چالیس گز دُور تک چھرّے پھیل جاتے ہیں۔

"تم نے فائر کھڑے ہو کر کیا تھا یا بیٹھ کر؟"

"کھڑے ہو کر" ـــــ اس نے جواب دیا۔

میں نے ابھی وہ جگہ کسی مصلحت کی بنا پر نہیں دیکھی تھی جہاں محسن گرا اور مرا تھا۔ میں نے رگھوناتھ کی بندوق ساتھ لے لی تھی جو ایک کانسٹیبل کے پاس تھی۔ اُسے بلایا اور میں بندوق لے کر وہاں جا کھڑا ہوا جہاں سے رگھوناتھ نے بتایا تھا کہ اُس نے فائر کیا تھا۔ میں نے بندوق کندھے سے فائر کی پوزیشن میں لگا کر اُس جگہ کو نشست میں لیا۔ وہ جگہ نیچے تھی۔ اگر محسن اُس جگہ سے صرف دو گز پرے کھڑا یا بیٹھا ہوتا تو بھی اُسے کوئی چھرّا نہ لگتا کیونکہ چھرّے کچھ تو فاختہ کو لگتے اور باقی زمین میں چلے جاتے۔ اس جگہ کے قریب کوئی گھاس نہیں تھی۔ گھاس دائیں طرف تھی اور مینڈھ سے کم بلندی کی زمین پر تھی۔

"اب مجھے بتاؤ کہ محسن کونسی گھاس میں چھپا ہُوا تھا جہاں وہ تمہیں نظر نہیں آسکا"۔۔۔۔میں نے کہا۔۔۔۔"میں یہاں کھڑا ہوتا ہوں، تم وہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ اُس گھاس کے پیچھے چلا گیا جو فاختہ کی جگہ سے دائیں طرف تھی۔ وہ وہاں جا کر کھڑا ہُوا تو مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ گھاس اُس کے گھٹنوں تک تھی۔ دوسرے دونوں لڑکوں نے مجھے بتایا تھا کہ محسن کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا۔

میں نے رگھوناتھ کو آواز دے کر کہا۔۔۔۔"بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گیا۔ تب بھی اُس کا سر کانوں سے کچھ نیچے تک مجھے نظر آ رہا تھا اور گھاس میں سے بھی وہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گھاس اونچی ضرور تھی، اتنی گھنی ہرگز نہیں تھی کہ اُس میں آدمی چھپ جاتا۔ اِس کے علاوہ قابلِ غور امر یہ تھا کہ وہ جگہ فاختہ والی جگہ سے دائیں کو اور کچھ آگے تھی۔ فاختہ پر گولی چلاتے اُس طرف ایک بھی چھرّہ نہیں جا سکتا تھا۔

میں اُس جگہ گیا جہاں وہ کھڑا تھا۔ وہاں میں نے خون دیکھا۔ زمین نرم تھی۔ اس پر محسن کے تڑپنے کے نشان صاف تھے۔ کھُرے چونکہ لاش اٹھانے والوں کے قدموں تلے گڈمڈ ہو گئے تھے، اس لیے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ محسن کہاں سے چلا تھا! وہ زیادہ نہیں چل سکا تھا۔ میں نے کھُروں کی پروا نہ کی۔ معاملہ گڑبڑ تھا۔ میری رائے کے مطابق اس خونی ڈرامے میں فاختہ کا وجود نہیں تھا۔ اگر فاختہ تھی بھی اور اگر اسی جگہ تھی جہاں رگھوناتھ نے بتایا تھا تو محسن فائر کی لائن سے دُور تھا۔ میرے اندر پولیس کی جو حِس تھی وہ بتاتی تھی کہ گولی فاختہ پر نہیں محسن پر چلائی گئی ہے۔ لیکن ثبوت؟ کوئی شہادت؟ گولی کھانے والا مر گیا تھا۔ گولی چلانے والا مجھے چکر دے رہا تھا۔ ثبوت اور شہادت کی فراہمی میرا مسئلہ تھا۔ مجھے ایک سوال کا جواب درکار تھا۔ وہ یہ کہ محسن کے جسم سے چھرّے کس طرف سے داخل ہوئے؟ سامنے سے؟ پیچھے سے یا پہلو کی طرف سے؟

اس کا جواب پوسٹ مارٹم رپورٹ دے سکتی تھی جو ابھی مجھے ملی نہیں تھی۔

میں نے رگھوناتھ سے کہا۔۔۔۔"یار! تم پھر سوچ لو۔ تم بھول رہے ہو۔ محسن یہاں نہیں تھا یا فاختہ وہاں نہیں تھی یا تم نے وہاں سے گولی نہیں چلائی تھی۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ کون کہاں تھا اور تم نے گولی کہاں سے چلائی تھی؟" اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "لیکن جواب دینے سے پہلے میرے اس سوال کا جواب بھی سوچ لینا کہ تم نے پہلے مجھے یہ جگہیں کیوں بتائی تھیں؟" اُس کے چہرے پر آئی ہوئی رونق واپس چلی گئی۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے گولی کہاں سے چلائی تھی، فاختہ کہاں تھی اور محسن کہاں تھا"۔۔۔۔اُس نے کہا اور التجا کے لہجے میں بولا۔۔۔"داروغہ جی! آپ میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے کہ محسن کو اتفاقیہ گولی لگ گئی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں نے اُسے جان بوجھ کر گولی ماری ہو۔ وہ میرا بڑا گہرا دوست تھا۔"

"میں یہی یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ محسن کو اتفاقیہ گولی لگی ہے"۔۔۔۔میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔۔۔"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔"

مَیں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ میں زمین سے گواہی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ خراب نہ ہونا پڑا۔ کچّی زمین نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ ایک جگہ جُوتوں کے نشان تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں کوئی آ کر رُکا ہے۔ یہ جُوتے اُسی طرف چلے جس طرف محسن مرا تھا۔ دو تین قدم آگے مجھے ایک خالی کارتوس ملا جو میں نے اٹھا لیا۔ وہاں سے میں نے اُس طرف دیکھا جہاں محسن گِرا تھا۔ راستے میں نظر کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ گولی آسانی سے ماری جا سکتی تھی۔ چھرّے پیچھے سے داخل ہوتے ہوں گے۔ اگر محسن اِدھر دیکھ رہا ہوتا تو رگھوناتھ اُس پر فائر نہ کرتا۔ اُس جگہ سے گھاس تک رگھوناتھ کے جُوتوں کے نشان تھے۔

"تم نے یہاں سے گولی چلائی تھی" ——— میں نے رگھوناتھ سے کہا ——— "اور یہ تمہارا آخری کارتوس ہے۔"

اُس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا۔ اُس نے مجھے جھٹلانے کی کوشش کی، لیکن اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اُسے ایک کانسٹیبل کے حوالے کردیا اور مسلمان لڑکے کو بُلایا۔ میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ان سے پوری تفتیش یہاں نہیں کروں گا۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ البتہ کسی لمحے یہ شک ہوتا تھا کہ لڑکے ڈر گئے ہیں اور وہ اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہیں، یہ اتفاقیہ حادثہ ہی ہوسکتا ہے۔ اگر یہ قتل کی ہی واردات تھی تو مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ دوسرے دو لڑکے بھی اعانتِ جرم کے مجرم ہیں یا نہیں۔ قتل کی صورت میں وہ رگھوناتھ کی سکیم میں شامل ہوں گے۔

مسلمان نوجوان میرے پاس آیا تو میں نے اُس سے پُوچھا ——— "تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ میں مسلمان ہوں۔"

"جی۔ مجھے معلوم ہے۔"

"اور مجھے معلوم ہے کہ تم بھی مسلمان ہو" ——— میں نے کہا۔

"اور ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ایک مسلمان نوجوان ایک ہندو کے ہاتھوں مارا گیا ہے تو آؤ دوست سچّی باتیں کریں۔ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے خواہ ایک گھنٹہ سوچو، میں پُورا موقعہ دوں گا، لیکن بلا سوچے جواب نہ دینا..... سچ بتاؤ جب رگھوناتھ نے فائر کیا تھا تم کہاں تھے؟"

"میں رہٹ پر پانی پینے چلا گیا تھا" ——— اُس نے رہٹ کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا ——— "میں نے وہاں گولی کی آواز سنی اور پانی پی کر واپس آرہا تھا تو رگھوناتھ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بُلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا دوڑ کر آؤ، محسن کو گولی لگ گئی ہے۔ میں دوڑا گیا تو محسن مرا پڑا تھا۔ رگھوناتھ نے بتایا کہ اُس نے فاختہ پر فائر کیا،

تو چھرّے محسن کو جا لگے۔ رگھوناتھ کو معلوم نہیں تھا کہ محسن آگے ہے۔"

"یہ تمہیں رگھوناتھ نے بتایا تھا؟" ——— میں نے پُوچھا۔

"جی۔"

"اور تم نے مری ہُوئی فاختہ دیکھی تھی؟"

"نہیں۔"

"اور تمہیں یاد ہے کہ تھانے میں تم نے مختلف بیان لکھوایا ہے؟"

اُس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جن میں یہ تاثر تھا ——— "مجھے معاف کردینا، میں نے پہلے جھُوٹ بولا تھا۔"

لڑکا اب بھی سچ نہیں بول رہا تھا۔ میں نے اُسے بھیج دیا اور رگھوناتھ کے ہندو دوست کو بُلایا۔

"اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا" ——— میں نے اِس ہندو نوجوان سے کہا ——— "دیکھ لو میرے ہاتھ میں بندوق ہے۔ گولی مار کر رپورٹ لکھ دوں گا کہ میرے ہاتھ سے اس لڑکے کو اتفاقیہ گولی لگ گئی ہے .... جب رگھوناتھ نے گولی چلائی تم کہاں تھے؟"

مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس ہندو کی حالت کیا ہوگئی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ اُس کے گھٹنے ابھی دوہرے ہوکر زمین سے لگ جائیں گے اور مجھے اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے پڑیں گے۔ اُس کے ہونٹ جلانے والی لکڑی کی طرح خشک ہوگئے اور آنکھوں سے جوانی کی چمک غائب ہوگئی۔ اُس نے کئی بار ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی ہی مشکل سے بولا۔

"مجھے رگھوناتھ نے کہا تھا کہ وہاں میں نے خشک ٹہنیاں پڑی دیکھی ہیں وہ اُٹھا لاؤ۔ جو پرندے مارے ہیں وہ یہاں آگ پر روسٹ کرکے کھالیں گے۔ میں چلا گیا اور گندم کی فصل کی اوٹ میں ہوگیا۔ مجھے گولی کی آواز آئی اور ایک چیخ سنائی دی۔ میں دوڑتا واپس آیا۔ رگھوناتھ

چلّا رہا تھا۔ جلدی آؤ، محسن کو گولی لگ گئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ گھاس میں بیٹھا پیشاب کر رہا ہے۔ میں نے فاختہ پر فائر کیا تو چھرّے اُسے جا لگے۔ سچ پوچھیں تو محسن کو تڑپتا ہُوا دیکھ کر میرے ہوش ٹھکانے نہیں رہے"—— یہ کہہ کر وہ رو پڑا۔

"وہ تڑپتا رہا تھا؟"

"جی۔ بہت دیر۔"

"تم نے مری ہوئی فاختہ دیکھی تھی؟"

"نہیں جی!"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تھانے میں تم نے مجھے وہ بیان لکھوایا تھا جو تمہیں رگھوناتھ نے بتایا تھا۔"

"جی ہاں"—— اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "آپ مجھے گولی تو نہیں ماریں گے؟"

"نہ بیٹا!"—— میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ——

"تھانے میں چل کر مجھے ساری باتیں سچ سچ بتا دینا۔ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔"

میں نے دونوں دیہاتیوں سے کچھ بھی نہ پُوچھا۔ انہیں بلا کر تسلّی آمیز لہجے میں کہا —— "تم نے تو اِن لڑکوں کی مدد کی تھی، لیکن یہ مدد تمہیں تھوڑی مہنگی پڑے گی۔ وہ دیکھو کچھ آدمی کھڑے ہیں۔ اگر تمہارے گاؤں کے ہیں تو انہیں کہہ آؤ کہ تم تفتیش کے سلسلے میں آج رات اور شاید کل بھی پولیس کے ساتھ رہو گے۔ جاؤ گھر پیغام بھجوا دو اور اُنہیں کہنا کہ گھبرائیں نہیں۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

میں نے تفصیلی پُوچھ گچھ تھانے میں جا کر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں دیہاتیوں نے اپنے گھروں کو پیغام بھجوا دیا اور میرے پاس آ گئے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان سب کو تھانے لے چلو۔ بندوق اور کارتوس کا خالی کھوکھا بھی اُسے دے کر کہا کہ یہ ایگزیمینر کے پاس بھیجنا ہے۔ یہ ضلعی

شہر میں جانا تھا۔ ماہرین نے رپورٹ لکھنی تھی کہ اس بندوق سے فائر کیا گیا ہے اور خالی کارتوس اسی بندوق کے بور کا ہے۔

میں گھوڑے پر سوار ہو کر تھانے کو چلا تو اس معاملے میں میرا ذہن صاف تھا کہ یہ حادثہ نہیں قتل ہے اور یہ قتل سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے، مگر میرے سامنے ایک قانونی الجھن آ پڑی۔ وہ یہ تھی کہ تفتیش شروع کرنے سے پہلے ابتدائی رپورٹ لکھنی پڑتی ہے جسے ایف۔ آئی۔ آر (فسٹ انفارمیشن رپورٹ) کہتے ہیں۔ یہ رپورٹ اُس کے نام سے لکھی جاتی ہے جو تھانے میں رپورٹ لے کر آتا ہے۔ اس کیس میں ایف۔ آئی۔ آر مقتول کے باپ یا بھائی یا کسی عزیز رشتہ دار کے نام کی ہونی چاہیئے تھی مگر مقتول کا باپ ہندوؤں کے ساتھ آ کر کہہ گیا تھا کہ اسے کوئی شکایت نہیں اور وہ کوئی رپورٹ نہیں کرے گا۔

مجھے شک میں مبتلا محسن (مقتول) کی بہن نے کیا تھا۔ یہ شک درست نکلا۔ میں اُس کے نام کی ایف۔ آئی۔ آر تیار کر سکتا تھا، لیکن میں نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ مسلمان لڑکی تھی۔ میں اُسے تھانے اور عدالتوں کے چکّروں میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وکیل بھری عدالت میں ایسی جرح کر بیٹھتے ہیں جو عورت ذات کی آبرو کو مجروح کر دیتی ہے۔ یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ میں اپنے نام سے ایف۔ آئی۔ آر تیار کروں اور ظاہر کروں کہ میں نے اپنے شک کی بنا پر تفتیش کی اور معاملہ کچھ اور نکلا، مگر اس میں یہ نقصان تھا کہ میری حیثیت صرف گواہ کی رہ جاتی۔ میں تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ تفتیش کوئی اور کرتا۔ وہ میرا اے۔ ایس۔ آئی تھا جس پر مجھے بھروسہ نہیں تھا کیونکہ وہ خبیث قسم کا ہندو تھا۔ میں تفتیش خود ہی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ کوشش کرنی تھی کہ محسن کا باپ یہ رپورٹ درج کرانے پر آمادہ ہو جائے کہ اس کے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔

تھانے میں پہنچے تو سورج ہو گیا تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ رگھوناتھ کو حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ دونوں دیہاتیوں

کے کھانے اور سونے کا بندوبست کرایا۔ رگھوناتھ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے متعلق میں نے حکم دیا کہ انہیں بھوکا رکھو۔ پانی مانگیں تو دے دو۔ رگھوناتھ تو حوالات میں تھا۔ دوسرے دونوں کو کانسٹیبلوں کے کمرے میں بھیج دیا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ رگھوناتھ کا باپ اور چار پانچ ہندو پرے کھڑے تھے اور مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہُوا کہ محسن کا باپ بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں جب احکام دے کر فارغ ہُوا تو ہندوؤں کا یہ وفد میرے پاس آگیا۔ میں برآمدے میں تھا۔ رگھوناتھ کے باپ نے اکھڑے ہوتے لہجے میں پُوچھا ''آپ نے میرے بیٹے کو حوالات میں کیوں ڈال دیا ہے؟''

''آپ کو اس 'کیوں' کا جواب جلدی مل جائے گا'' ___ میں نے جواب دیا ___ ''میں اُسے سزا تو نہیں دے سکتا۔ آپ کو پورا موقعہ ملے گا کہ اسے قید سے رہا کرالیں۔ ابھی مجھے اپنی ڈیوٹی پوری کرنے دیں۔''

ہر ایک ہندو نے کچھ نہ کچھ کہا۔ اُن کی باتوں میں خوشامد بھی تھی، دھمکی بھی تھی اور حیرت بھی تھی۔ اس سے ایک سال پہلے ایک واردات میں شہر کے ہندو مجھے پریشان کر چکے تھے۔ یہ ہندوستان کے دُور اندر کا ایک قصبہ تھا جس کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی۔ اس سے پہلے ہندو تھانے کے سامنے میرے خلاف باقاعدہ مظاہرہ کر چکے تھے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر کو فون پر اطلاع دی، تو وہاں سے ایک انگریز انسپکٹر آگیا اور اُس نے ہندوؤں کو بُلا کر کہا تھا کہ انہوں نے پولیس کے کام میں دخل دے کر ایک جرم کو سیاسی یا مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی تو تمام لیڈروں اور سرکردہ ہندوؤں کو اخلاقی مجرموں کی حیثیت سے گرفتار کر لیا جائے گا۔ اُس نے دو معزز ہندوؤں کو تھانے میں بٹھا بھی لیا تھا۔

اب اس واردات میں بھی ہندوؤں نے وہی حرکت شروع کر دی

تھی۔ میں نے اُنہیں پچھلا واقعہ یاد دلا کر ڈرایا دھمکایا اور کانسٹیبلوں سے کہا کہ انہیں تھانے کے احاطے سے باہر نکال دو۔ میں نے محسن کے باپ کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا ___ ''آپ میرے پاس ٹھہریں۔''

اُدھر سے محسن کا بڑا بھائی بھی آگیا۔ کانسٹیبلوں نے اُسے بھی واپس جانے کو کہا۔ میں نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ ہندو چلے گئے تو میں باپ اور بھائی کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ انہیں بٹھایا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ چھرّے پیچھے سے دائیں پہلو میں داخل ہوئے ہیں۔ جو چھرّے کھال کے قریب لگے وہ پار ہو گئے، باقی جسم میں لگے۔ یہ چونکہ پھیل گئے تھے، اِس لیے دو چھرّے دائیں گُردے میں اُتر گئے اور وہیں سے برآمد ہُوئے۔ ڈاکٹر نے زخم کی لمبائی چوڑائی بھی لکھی تھی جو مجھے یاد نہیں رہی۔ چھرّوں کی تعداد بھی لکھی تھی اور یہ جسم سے جہاں جہاں سے برآمد ہُوئے وہ بھی لکھا تھا۔

میں نے یہ رپورٹ الگ رکھ دی اور مقتول کے باپ اور بھائی کی طرف متوجّہ ہُوا۔ اپنے بیٹے کے چال چلن کو کون بُرا کہتا ہے، پھر بھی میں نے ان دونوں سے پُوچھا کہ محسن کا چال چلن کیسا تھا۔ دونوں نے کہا کہ اچھا تھا۔ انہیں کبھی کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔

''رگھوناتھ کی بہن کا آپ کے گھر آنا جانا تھا؟''

''ہاں'' ___ بھائی نے جواب دیا ___ ''وہ میری بہن کی سہیلی ہے۔''

''آپ نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ محسن اس لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے؟''

''نہیں نہیں'' ___ باپ نے جواب دیا اور حیرت سے پُوچھا ___ ''آپ کو کس نے بتایا کہ یہ ہندو لڑکی ہمارے گھر آتی جاتی تھی ہے؟'' باپ کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی بیٹی چوری چھپے مجھے بتا گئی ہے۔

''آپ فی الحال میرے سوالوں کے جواب دیں'' ___ میں

نے کہا ــــــــ ”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محسن حادثاتی موت نہیں مرا۔ اُسے قتل کیا گیا ہے۔“

باپ بیٹا اُچھل پڑے۔ باپ نے پوچھا ــــــــ ”کیا آپ کو یقین ہے؟“

”ابھی کسی سے بات نہ کرنا“ ــــــــ میں نے کہا ــــــــ ”میں مسلمان ہوں۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک ہندو ایک مسلمان کو قتل کر کے صاف بچ جائے۔ آپ ہندوؤں کی باتوں میں آگئے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ رپورٹ نہیں کریں گے۔“

”میں اب بھی کہتا ہوں کہ ہم رپورٹ نہیں کریں گے“ ــــــــ بھائی نے غصّے سے کہا ــــــــ ”میں قتل کا انتقام لوں گا۔“

”ہوش کی بات کرو بھائی“ ــــــــ میں نے اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا ــــــــ ”انتقام لینے کے لیے میں جو موجود ہوں۔“ میں نے باپ سے کہا ــــــــ ”میں آپ کے نام کی رپورٹ درج کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اِن ہندوؤں سے نہ ڈریں۔“

”میں کسی بھی وقت ان ہندوؤں سے نہیں ڈرا“ ــــــــ باپ نے کہا ــــــــ ”میں نے اسے حادثہ سمجھ کر دل کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ چلو، میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ان ہندوؤں کے ساتھ چونکہ اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے، اس لیے اتنے بڑے حادثے کو بھی میں نے قبول کر لیا ہے۔ اب صورت کچھ اور ہی ہو گئی ہے۔ آپ خود ہی میرے نام کی رپورٹ لکھ کر میرے دستخط لے لیں۔“

یہی میرا مسئلہ تھا جو باپ نے حل کر دیا۔ میں بولتا گیا اور وہ لکھتا گیا۔ اُس کے دستخط کرائے اور نہایت اطمینان سے ایف۔ آئی۔ آر تیار کی۔ باپ اور بھائی نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ محسن کے تعلّقات رگھوناتھ کی بہن کے ساتھ واقعی تھے یا نہیں۔ میں نے انہیں گول گول باتوں سے ٹال دیا اور تسلیاں دے کر بھیج دیا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ایک بار پھر غور سے پڑھی۔ میں نے چونکہ پیٹ کے زخموں کے کئی ایک زخمی دیکھے تھے، اس لیے مجھے معلوم تھا کہ پیٹ پھٹ جانے سے موت فوراً واقع نہیں ہوتی، بلکہ زخمی ہوش میں رہتا ہے اور خاصی دیر بعد مرتا ہے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ وقت زیادہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے امید تھی کہ سِول سرجن ابھی سویا نہیں ہوگا۔ میں رات کو تینوں لڑکوں سے تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ اِس سے پہلے میں سِول سرجن سے وہ باتیں پوچھنا چاہتا تھا جو پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ کر میرے ذہن میں اٹھی تھیں۔ رگھوناتھ نے بتایا تھا کہ اُس نے بندوق فائر کی۔ اُسے چیخ سُنائی دی۔ محسن گھاس سے اُٹھا اور گر پڑا۔ رگھوناتھ اُس تک پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔ میرے تجربے کے مطابق وہ اتنی جلدی نہیں مرا ہوگا۔

سِول ہسپتال دُور نہیں تھا۔ سِول سرجن ہسپتال کے احاطے میں ہی رہتا تھا۔ اوبرین نام کا عیسائی تھا اور بہت ہی اچھا انسان۔ اُس کے دروازے پر دستک دی تو وہ خود ہی باہر آگیا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا ــــــــ ”میں اپنی فیملی کو آج کے پوسٹ مارٹم کی کہانی سُنا رہا تھا۔“

”اور میں مکمل کہانی سنانے آیا ہوں“ ــــــــ میں نے کہا اور اُس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اُس کی بیوی اور تین بچّے میرے پیچھے پڑ گئے۔ کہتے تھے کہ اس آدمی کو کس طرح گولی لگی ہے اور اُسے کیوں گولی ماری گئی ہے۔ میں نے اُنہیں کہانی سُنا دی اور ڈاکٹر اوبرین سے پوچھا کہ اس قسم کے زخم سے کیا انسان فوراً مر سکتا ہے؟

”نہیں“ ــــــــ اُس نے جواب دیا ــــــــ ”میں نے ایسے زخمیوں کو بھی ہوش میں باتیں کرتے دیکھا ہے جن کے پیٹ سامنے سے کھُلے ہوئے تھے اور ان کی انتڑیاں وغیرہ باہر آ گئی تھیں۔ بعض

کیسوں میں یوں ہوتا ہے کہ زخم آتے ہی یا گولی لگنے سے انسان اچانک
صدمے (شاک) سے بیہوش ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا کمزور دل بھی ہوتا
ہے جس کی حرکتِ قلب صدمے یا موت کے خوف سے بند ہو جاتی ہے۔
اس (محسن کے) کیس میں زخمی کو اگر طبّی امداد نہیں دی گئی تو وہ نصف
سے پون گھنٹہ تک ہوش میں رہا ہوگا۔ خون نکل جانے کی وجہ سے وہ
آہستہ آہستہ پہلے بیہوش ہُوا پھر مرا ہوگا۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اس
کو طبّی امداد نہیں ملی تھی اور خون روکنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ اگر
کوشش کی بھی جاتی تو ناکافی ہوتی کیونکہ اس قسم کے زخموں کی مرہم پٹّی
ہو ہی نہیں سکتی۔ گُردہ بھی پنکچر ہو گیا تھا۔ اس سے بھی موت فوری واقع
نہیں ہوتی۔"

میں یہی سُننا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ آئی تھی کہ مقتول نے
مرنے سے پہلے کوئی بات کی ہوگی۔ یہ بتانا ناممکن تھا کہ گولی لگنے اور مرنے
کا درمیانی عرصہ کتنا تھا۔ البتہ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ پوسٹ مارٹم کے
وقت مقتول کو مرے تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے ڈاکٹر اوبرین
کے ساتھ مل کر اِن تین گھنٹوں کو یوں تقسیم کیا۔ لاش تھانے میں آئی،
تو لاش لانے والوں سے مختصر باتیں کیں، پوسٹ مارٹم کی کاغذی تیاری
اور لاش کو ہسپتال تک پہنچنے اور پوسٹ مارٹم شروع ہونے تک
ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا۔ موقعۂ واردات سے تھانے تک لاش کو
پہنچنے میں ایک گھنٹہ اور چند منٹ۔ موقعۂ واردات سے لڑکا بھاگا گیا
اور اس کے ساتھ چار آدمی آئے، لاش چارپائی پر ڈالی اور اٹھائی۔
اس میں نصف یا پون گھنٹہ صرف ہُوا ہوگا۔

ڈاکٹر اوبرین نے کہا تھا کہ چھرّے جسم میں داخل ہونے سے
نصف یا پون گھنٹہ بعد محسن مرا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے وقت
کا جو تعین کیا اور اسے جس طرح تقسیم کیا وہ صحیح تھا۔ مقتول دیہاتیوں
کے آنے پر مرا ہوگا اور ہو سکتا ہے اُس وقت بیہوش ہو اور یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ محسن اُن کے آنے سے ایک آدھ منٹ پہلے مرا ہو۔ ڈاکٹر اوبرین
نے اپنے علم اور تجربے کے مطابق میری خوب راہنمائی کی۔ وہ خود بھی
مخلص اور محنتی آدمی تھا، اس لیے مخلص اور محنتی آدمی کی قدر کرتا تھا۔
میں جس طرح جنون کی کیفیت میں وقت کی تقسیم کر رہا تھا اس طرح میرے
سامنے ڈاکٹر اوبرین کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے ضرور کہتا "جاؤ
بھائی، تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

میری حالت یہ تھی کہ صبح سے وردی میں تھا اور رات کے گیارہ
بج گئے تھے۔ میں تھانے گیا۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ میرے لیے کھانا
دفتر میں ہی لے آئے اور دونوں دیہاتیوں کو میرے پاس بھیجا جائے۔

وہ دونوں آئے تو میں نے اُنہیں کہا کہ وہ ذہن پر زور دے
کر یاد کریں اور مجھے بتائیں کہ انہوں نے جب لاش کو اٹھایا تو وہ کہیں
زندہ ہی تو نہیں تھا؟

"عالی جاہ!" —— ایک دیہاتی نے جسے میں ذرا سیانا سمجھتا
تھا کہا —— "ہم لاش تھانے لائے تو آپ نے ہمیں بولنے کا موقع
ہی نہیں دیا۔ آپ نے سوال کئے، ہم نے جواب دیے۔ ہم آپ کے
اَن پڑھ خادم اپنی مرضی سے کوئی فالتو بات کہنے سے ڈرتے تھے۔
وہ تو یوں کہیئے کہ مرنے والا ہمارے ہاتھوں میں مُرا ہے۔ ہم وہاں پہنچے
تو اسے لاش ہی سمجھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں، منہ بند تھا، چہرے سے
خون ختم ہو چکا تھا۔ لڑکوں نے کہا کہ مر گیا ہے۔ ہم اُسے اٹھانے لگے تو
اُس نے آنکھیں کھول دیں، مگر وہ ہوش میں نہیں آرہا تھا۔ یہ آخری وقت
کی نشانی تھی۔ نظریں پھری ہوئی تھیں۔ ہم نے اُس کے حلق میں ہلکا سا
خراٹہ سُنا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تب اس کی جان نکل گئی۔ اُس
وقت میرے ہاتھ اُس کی گردن کے نیچے تھے۔"

"دو گاؤں میں کونسا لڑکا گیا تھا؟"

اُس نے جو حلیہ بتایا وہ ہندو لڑکے کا تھا۔ مسلمان لڑکا موقعہ

واردات پر موجود رہا۔

"میں نے لڑکوں کو گالی دے کر کہا تھا کہ اتنی دیر تم کھڑے تماشہ دیکھتے رہے" ——— دیہاتی نے کہا ——— "لعنت ہے تمہاری تعلیم پر۔ تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اپنی قمیض اتار کر اس کے زخم پر باندھ دیتے۔ خون رُک جاتا اور ہم اسے زندہ ہسپتال پہنچا دیتے۔ ان لڑکوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔"

ان سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور انہیں رخصت کر دیا۔ تھکن سے میری حالت تو بہت بُری ہو گئی تھی لیکن میں تفتیش کو ڈھیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ہندو میرے بالائی حکام تک پہنچ کر کیس چوپٹ کر دیں گے۔ میں نے رات ہی رات اگر مکمل نہیں تو زیادہ سے زیادہ سراغ اور شہادت حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ میں رگھوناتھ سے ابھی کچھ بھی نہیں پُوچھنا چاہتا تھا۔ اُسے پُوری طرح پھانسنے کے لیے مجھے جال تیار کرنا تھا۔ میرے پاس دو نوجوان تھے۔ یہ رگھوناتھ کے دوست تھے۔ ایک ہندو دوسرا مسلمان۔ پولیس اور تھانے کی دہشت نے انہیں موم کر رکھا تھا۔ میں نے مسلمان لڑکے کو اندر بلایا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔

یہ نوجوان میرے سامنے آیا تو اُس کی حالت بہت ہی بُری ہو چکی تھی۔ سوائے پانی کے اُس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ دن بھر کی تھکن تھی۔ نیند تھی اور جو خوف اُس پر طاری تھا وہ اُس کا خون چُوس رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوف اور مُردنی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ایک مسلمان بھائی کو ایک ہندو کے ہاتھوں مروا کر تم اتنے دلیر ہو گئے ہو کہ اُس کے ساتھ پھانسی چڑھنے کے لیے تیار ہو۔"

اُس کے ہونٹ کانپے مگر زبان نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔

میں نے غصّے سے پوچھا۔ "رگھوناتھ نے تمہیں کتنے پیسے دیئے ہیں؟"

"نہیں داروغہ صاحب!" ——— اُس نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر اور روتی ہوئی آواز میں کہا ——— "خدا کی قسم داروغہ صاحب! میں نے اُسے نہیں مروایا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ...."

"تم تینوں نے مِل کر اُسے قتل کیا ہے" ——— میں نے اس نوجوان کے جسم سے خُون کا آخری قطرہ بھی خشک کر دینے کے لیے کہا ——— "کالا پانی جانتے ہو؟ ہندوستان سے دُور کالے سمندر میں وہ جزیرہ سُنا ہے جسے انڈمان کہتے ہیں، تم سیدھے وہاں جا رہے ہو۔ بوڑھے ہو کر اور بھکاری بن کر وہاں سے آؤ گے۔"

جسمانی اذیّت دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں وہ کس طرح کھڑا تھا۔ اُس میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں تھی۔ اُس نے میری منّت سماجت کی اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہاں جو کچھ ہُوا ہے وہ سچ سچ بتا دو۔

"پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟" ——— اُس نے بچّوں کی طرح پُوچھا۔

"جب رگھوناتھ نے گولی چلائی اُس وقت تم کہاں تھے؟" ——— مَیں نے اُس کے سوال کا جواب دیئے بغیر پُوچھا۔

"میں رہٹ پر پانی پینے چلا گیا تھا" ——— اُس نے جواب دیا۔ "رہٹ آپ نے دیکھا تھا۔ وہاں قریب ہی ہے۔ رگھوناتھ نے گولی چلائی تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ مجھے ایک اور آواز بھی سنائی دی۔ میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کسی انسان کی چیخ تھی یا کوئی گیدڑ بولا تھا۔ میں نے اس آواز پر توجّہ نہ دی۔ میں نے دیکھا کہ رگھوناتھ کھڑا مجھے بلا رہا تھا اور ہاتھ سے اشارے کر رہا تھا۔ میں اس امید پر دوڑتا گیا کہ رگھوناتھ نے کوئی بڑا جانور مارا ہے۔ وہاں گیا تو دیکھا کہ محسن دونوں ہاتھ پہلو پر رکھے زمین پر تڑپ رہا تھا۔

اُس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے.....

"میرے تو ہوش گم ہو گئے۔ رگھوناتھ نے مجھے بتایا کہ اُس نے فاختہ پر گولی چلائی تھی، لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ محسن گھاس میں چھپا ہُوا پیشاب کر رہا ہے۔ فاختہ تو مر گئی لیکن محسن کو بھی چھرّے لگ گئے ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ محسن نے بڑی زور سے کہا —— 'تو نے ہندوؤں کی طرح دوستی کا دھوکہ دے کر پیچھے سے وار کیا ہے۔ زندہ رہا تو انتقام لوں گا۔' میں نے رگھوناتھ کی طرف دیکھا تو اُس نے معصومیت سے کہا —— 'یار! یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے اسے جان بوجھ کر تو گولی نہیں ماری' —— محسن پہلو کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس نے 'پانی پانی' کہا تو رگھوناتھ نے مجھے رہٹ سے پانی لانے کو کہا۔ میں پانی لانے دوڑ پڑا۔ وہاں کوئی نہیں تھا جس سے میں پیالہ مانگتا۔ میں پہلے یہاں پانی پینے آیا تھا، لیکن پیئے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ اب وہاں دیکھا ایک کچّا کمرہ تھا، مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ پانی لے جانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ گھبراہٹ نے عقل مار دی تھی۔ دُور دو بچّے کھیتوں میں کچھ کر رہے تھے۔ انہیں آوازیں دیں۔ وہ آئے تو میں نے انہیں کہا کہ پانی لے جانے کے لیے کوئی برتن لا دو۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے پاس کوئی برتن نہیں ہے۔ ایک بچّے نے مجھے کہا کہ رہٹ کا ایک لوٹا کھول لو۔ تب مجھے خیال آیا کہ رہٹ کے ساتھ مٹی کے لوٹے ہیں۔ وہ رسّیوں سے بندھے ہُوتے تھے۔ بہت ہی مشکل سے ایک کی رسّی کھولی۔ یہ خالی تھا۔ بچوں نے میرے ساتھ مل کر رہٹ چلایا تو نالی میں پانی آیا۔ میں نے لوٹے میں پانی ڈالا اور دوڑ پڑا۔"

"اُس وقت تمہارا ہندو ساتھی کہاں تھا؟"

"میں جب گولی چلنے کے بعد وہاں گیا تھا تو ہمارا ہندو ساتھی

وہاں نہیں تھا" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ معلوم نہیں کس طرف سے دوڑا آ رہا تھا۔ وہ آیا تو میں پانی لینے چلا گیا۔"

"محسن نے اُس ہندو کی موجودگی میں کہا تھا کہ زندہ رہا تو انتقام لوں گا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا" —— اُس نے جواب دیا —— "ہو سکتا ہے میں کچھ اور باتیں بھی بھول گیا ہوں۔ آپ تصوّر کریں جی کہ ہمارا ایک اتنا اچھا دوست زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اُس کا خون بہہ رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ مجھے تو چکّر آنے لگے تھے..... میں پانی لے کر گیا تو محسن کا جسم ساکن ہو گیا تھا۔ اُسے پیٹھ کے بل کیا۔ منہ میں پانی ٹپکایا لیکن پانی باہر آ گیا۔ ہمارا ہندو ساتھی گاؤں کی طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ اس سے مجھے اطمینان ہُوا کہ گاؤں سے آدمی آ کر محسن کو سنبھال لیں گے۔ رگھوناتھ مجھے پرے لے گیا اور کہنے لگا یار یہ غلطی سے میری گولی کے آگے آ گیا ہے۔ ہم تینوں کو پولیس پکڑ لے گی۔ میں تمہیں ایک سو روپیہ نقد دوں گا۔ سب سے یہی کہنا کہ یہ اونچی گھاس کے پیچھے پیشاب کر رہا تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مینڈھ پر فاختہ آن بیٹھی۔ اس پر فائر کیا تو چھرّے محسن کو جا لگے۔"

"اس سے پہلے تم نے مجھے جو بیان دیا تھا وہ رگھوناتھ کا بتایا ہُوا جھوٹا بیان تھا؟" —— میں نے پوچھا۔

"جی" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ بیان بالکل جھوٹا تھا۔"

یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ میں جس وقت کی واردات سُنا رہا ہوں اُس وقت کا ایک سو روپیہ آج کے اڑھائی ہزار روپے کے برابر تھا۔ بکرے کا گوشت چار آنے سیر اور چینی ایک روپے کی سوا چار سیر ملتی تھی اور ایک روپے کا آٹا ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ یہ مسلمان نوجوان ایک سو روپے کی لپیٹ میں اور پکڑے جانے کے خوف میں آ گیا تھا،

مگر تھانے اور تھانیدار کے خوف نے سچّی بات اگلوادی۔

"وہاں فاختہ تھی یا نہیں؟"

"قرآنِ پاک کی قسم، مجھے بالکل علم نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "مجھے تو اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ فاختہ کا خیال کیسے آتا۔"

"اب مجھے کچھ اور باتیں اسی طرح صحیح صحیح بتادو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "پھر میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا اور بڑے اچھے بستر میں سُلا دوں گا اور صبح چھٹی دے دوں گا۔"

اُس نے پانی مانگا اور کہنے لگا ـــــ "میرے ابّا جان تھانے کے گیٹ میں کھڑے ہیں۔ اتنی رات گزر گئی ہے۔ وہ وہیں کھڑے ہیں۔ آپ انہیں بُلا کر تسلی دے سکتے ہیں؟"

میں نے کانسٹیبل سے پانی لانے اور اس کے باپ کو یہاں لانے کو کہا۔ اُس کا باپ سخت خوفزدہ حالت میں قدم سوچ سوچ کر اٹھاتا میرے دروازے تک آیا۔ میں نے اُسے اندر بُلا کر کہا کہ اُس کے بیٹے کو میں نے صرف شہادت کے لیے روک رکھا ہے۔ یہ صبح گھر آجائے گا۔ باپ کے آنسو نکل آئے۔ یہ اطمینان کے آنسو تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر گھر چلا جائے۔ وہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ اس سے بیٹے کا حوصلہ قائم ہوگیا۔ اُس نے پانی بھی پی لیا۔

"محسن کے ساتھ تمہاری دوستی کتنی کچھ گہری تھی؟"

"بہت گہری" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ہم ایک دوسرے کو دل کی باتیں بھی بتایا کرتے تھے۔"

"پھر رگھوناتھ کی بہن کے متعلق محسن نے تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہوگا۔"

اُس نے مجھے حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ مجھے

جادوگر سمجھ رہا تھا جس نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ محسن کے مراسم رگھوناتھ کی بہن کے ساتھ تھے۔

"وہ تو محسن پر جان بھی قربان کرنے کو تیار رہتی تھی" ـــــ اُس نے بتایا ـــــ "بہت خوبصورت لڑکی ہے۔"

"چال چلن کی کیسی ہے؟"

"جہاں تک میں جانتا ہوں وہ اخلاق کی صاف ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "محسن کے سوا کسی سے آنکھ نہیں ملاتی۔ ماں باپ نے اُس کی شادی ایک بہت بڑے زمیندار کے بیٹے کے ساتھ طے کر دی تھی، لیکن لڑکی نے صاف جواب دے دیا تھا۔"

"اُس کی اور محسن کی ملاقاتیں باہر کہیں ہوتی تھیں؟"

"جی ہوتی تھیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آپ نے ندی کے کنارے پرانا مندر دیکھا ہے نا! وہاں ہندو عورتیں جاتی ہیں اور ندی میں نہاتی بھی ہیں۔ رگھوناتھ کی بہن بھی جاتی ہے، لیکن وہ مندر کے اندر نہیں جاتی۔ محسن ایک جگہ اُس کے انتظار میں ہوتا ہے۔ وہ جگہ اوٹ میں ہے۔ لڑکی وہاں چلی جاتی تھی۔"

"رگھوناتھ کو معلوم ہوگا؟"

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "محسن نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"محسن اور رگھوناتھ کی دوستی کتنی کچھ گہری تھی؟"

"خاصی گہری" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ہم چاروں گہرے دوست تھے۔"

میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ رگھوناتھ کو اپنی بہن اور محسن کے متعلق معلوم تھا یا نہیں، پوچھا ـــــ "کبھی رگھوناتھ اور محسن کا لڑائی جھگڑا نہیں ہُوا تھا؟" مجھے شک تھا کہ رگھوناتھ نے محسن سے اپنی بہن کے

ساتھ دوستی لگانے کا انتقام لیا ہے۔ اب اس لڑکے نے بتایا کہ اس لڑکی نے ایک رشتہ ٹھکرا دیا تھا تو میرا شک پکا ہو گیا کہ رگھوناتھ نے محسن کو راستے سے ہٹایا ہے۔

لڑکے نے جواب دیا ——— "کوئی ایک مہینہ گزرا رگھوناتھ اور محسن کی کہیں لڑائی ہوئی تھی۔ محسن نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے رگھوناتھ کی ٹھکائی کی ہے، لیکن یہ لڑائی رگھوناتھ کی بہن کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ رگھوناتھ ایک شریف مسلمان گھرانے کی لڑکی کو بدنام کرتا رہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ اُس کی دوستی ہے۔ محسن نے یہ یقین کر کے کہ لڑکی شریف ہے اور رگھوناتھ جھوٹ بولتا ہے، رگھوناتھ کو کہیں مارا پیٹا تھا۔ میں نے یہ لڑائی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے یہ دیکھا کہ محسن اور رگھوناتھ کی بات چیت بند ہو گئی تھی۔ پانچ چھ دن گزرے رگھوناتھ نے مجھے کہا کہ یار، محسن خواہ مخواہ ناراض ہو گیا ہے، ہمارا سمجھوتہ کرا دو۔ میں نے اور اس ہندو لڑکے نے اُن کی پھر سے دوستی کرا دی۔ اس کے دو تین روز بعد رگھوناتھ نے کہا کہ کسی روز شکار کے لیے چلیں گے۔ اُسی کے پروگرام پر ہم شکار کو گئے اور یہ حادثہ ہو گیا۔"

میں چکرا گیا۔ یہ معاملہ کچھ اور لگتا تھا۔ میں اس شریف مسلمان لڑکی اور رگھوناتھ اور محسن کی لڑائی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس لڑکے نے بتایا کہ اُس لڑکی کا ایک بھائی ہے جس کی عمر سولہ سال کے لگ بھگ ہے۔ رگھوناتھ اُسے دوست بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس لڑکے نے ہی محسن سے کہا تھا کہ رگھوناتھ اُسے اور اُس کی بہن کو پریشان اور بدنام کرتا ہے۔ یہ مسلمان لڑکی پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس گھرانے کا اتا پتہ لے لیا۔

اس مسلمان نوجوان نے کئی راز بتا دیئے۔ محسن نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ زندہ رہا تو انتقام لوں گا۔ رگھوناتھ اور محسن کی لڑائی بھی نیا اور کارآمد انکشاف تھا۔ میں نے اس لڑکے کو ایک کانسٹیبل کے

ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ کچھ کھانے کو ہے تو اسے کھلاؤ اور اسے اپنے کمرے میں آرام اور عزت سے سلا دو، اور ہندو لڑکے کو میرے پاس بھیج دو۔

یہ ہندو نوجوان میرے سامنے آیا تو اُس کی حالت مسلمان سے کہیں زیادہ خراب تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ برآمدے میں دیوار کے سہارے بھوکا بیٹھا رہا تھا۔ بھوک کی بجائے اس پر دہشت غالب تھی۔ اندر آتے ہی اُس نے رونا شروع کر دیا اور قسمیں کھانے لگا کہ اُس کا کوئی قصور نہیں۔

میں نے اُسے اور زیادہ ڈرایا اور کہا کہ اگر اُس نے جھوٹ بولا تو میں اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دوں گا۔ پھر اُسے بتایا کہ پھانسی کس طرح دی جاتی ہے اور پھانسی پانے والے کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ تشریح سُن کر اُس نے منہ کھول کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے چُپ کرانے کی کوشش نہ کی۔ وہ خود ہی چُپ ہُوا اور بولا ——— "میں سچی باتیں بتاؤں گا۔"

اُس کے ساتھ سوال وجواب کر کے میں نے جو حاصل کیا وہ یہ تھا کہ موقعۂ واردات پر جب مسلمان لڑکا رہٹ کی طرف چلا گیا تو رگھوناتھ نے اس ہندو لڑکے کو کچھ دُور ایک جگہ بتا کر کہا ——— "وہاں درختوں کی خشک ٹہنیاں پڑی ہیں، وہ اٹھا لاؤ۔ جو پرندے مارے ہیں، وہ یہیں روسٹ کر کے کھالیں گے" ——— یہ لڑکا اُدھر چلا گیا۔ اُسے بندوق کا دھماکہ سُنائی دیا۔ اُسے چیخ نہیں سُنائی دی۔ اُسے رگھوناتھ کی آواز سُنائی دی۔ یہ لڑکا فصل کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اُس نے رگھوناتھ کی جو آواز سُنی وہ کچھ اس طرح تھی کہ وہ مسلمان دوست کو بُلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ محسن کو گولی لگ گئی ہے۔ یہ ہندو واپس آ گیا اور وہاں پہنچا۔ محسن کو تڑپتا دیکھ کر اُس کی بھی وہی حالت ہوئی جو مسلمان لڑکے کی ہوئی تھی۔ خون نے اس کے اوسان خطا کر دیئے۔

مسلمان لڑکے کو رگھوناتھ نے محسن کے لیے پانی لانے کو بھیج دیا۔ ہندو لڑکے سے بھی رگھوناتھ نے کہا کہ سب کو یہی بتانا کہ اسے غلطی سے گولی لگ گئی ہے۔ اس لڑکے نے رگھوناتھ سے کہا کہ اسے اُس گاؤں میں اٹھالے چلتے ہیں ورنہ یہ مرجائے گا۔ رگھوناتھ نے جواب دیا ——— "مرجانے دو۔ سالا مسلمان ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اُس نے بتایا کہ محسن نے کہا تھا کہ تُو نے ہندوؤں کی طرح دوستی کا دھوکہ دے کر پیچھے سے وار کیا ہے۔ مَیں زندہ رہا تو بدلہ لوں گا۔ اُس وقت مسلمان لڑکا آچکا تھا اور اُس کے فوراً بعد محسن بے ہوش ہو گیا۔ رگھوناتھ نے اس ہندو سے کہا کہ اُس گاؤں میں جاؤ اور چارپائی کا بندوبست کرو۔ وہاں کہنا کہ ہمارے ایک دوست کو غلطی سے گولی لگ گئی ہے۔ لڑکا گاؤں کو دوڑا گیا جو وہاں سے کوئی زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہاں سے چار آدمی چارپائی اٹھائے آگئے۔ محسن اُس وقت تک مرچکا تھا۔

"اُسے جب اُٹھا کر چارپائی پر ڈالنے لگے تو وہ زندہ تھا۔" میں نے اس لڑکے سے کہا۔ میرا انداز سوال والا نہیں تھا۔

"میں نے نہیں دیکھا" ——— اُس نے کہا ——— "ایک دیہاتی نے بڑی زور سے کہا تھا کہ ابھی زندہ ہے۔"

دو دیہاتیوں اور دو لڑکوں نے چارپائی اُٹھائی اور شہر کو چل پڑے۔ دو دیہاتی گاؤں کو واپس چلے گئے۔ میں نے اس ہندو سے پوچھا کہ رگھوناتھ اور محسن کی لڑائی کس بات پر ہوئی تھی۔ اُس نے اُسی مسلمان لڑکی والی بات سُنائی جو مسلمان لڑکا سُنا گیا تھا۔ اُس نے مسلمان لڑکے کے بیان کی تائید کی۔

میں نے ہوا میں ایک تیر چلایا۔ میں نے کہا ——— "رگھوناتھ نے تم سے کہا تھا کہ وہ محسن سے انتقام لے گا۔" ہندو لڑکے نے ذرا سی بھی پس وپیش نہیں کی۔ بولا ——— "اُس نے دو تین بار کہا تھا کہ محسن نے

میری بہت بے عزتی کی ہے، میں اسے مزا چکھاؤں گا۔"

"اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ محسن خواہ مخواہ ناراض ہو گیا ہے، راضی نامہ کرادو" ——— میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں جی" ——— لڑکے نے کہا ——— "اُس نے یہ کہا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ تم اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لینا چاہتے ہو اور دوستی بھی کرنا چاہتے ہو۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔"

"رگھوناتھ کی بہن کیسی ہے؟" ——— مَیں نے پوچھا ——— "محسن کے ساتھ اُس کا میل ملاپ ہوگا؟"

"نہیں جی!" ——— اس ہندو نے عجیب سے لہجے میں کہا ——— "ہندو لڑکی کا میل ملاپ کسی مسلمان لڑکے کے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو اپنے جیسوں کو بھی پلّے نہیں باندھتی، بڑی زبردست لڑکی ہے۔"

اس سے مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ رگھوناتھ کی بہن اور محسن کی دوستی کا نہ رگھوناتھ کو علم تھا نہ اس ہندو کو، اور رگھوناتھ نے محسن سے اپنی بے عزتی اور ٹھکائی کا انتقام لیا ہے۔ محسن نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ تم نے ہندوؤں کی طرح دوستی کا دھوکہ دے کر پیچھے سے وار کیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ رگھوناتھ نے انتقام لینے کے لیے محسن کو راضی کیا تھا۔ اُسے شکار کے بہانے لے گیا۔ مسلمان لڑکا رہٹ پر پانی پینے چلا گیا تو رگھوناتھ نے ہندو ساتھی کو خشک ٹہنیاں اٹھا لانے کو بھیج دیا۔ وہ محسن کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ رگھوناتھ نے محسن کو اتنی دُور کس طرح بھیجا جہاں سے اُس نے اُسے گولی ماری۔ ہوسکتا ہے وہ خود دُور ہٹ گیا ہو۔ جونہی محسن نے پیٹھ پھیری رگھوناتھ نے گولی چلا دی۔

مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ رگھوناتھ نے اپنی ٹھکائی کا انتقام لیا ہے یا اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بہن کی دوستی محسن کے ساتھ ہے۔ میں یہ

معلومات رگھوناتھ سے حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایسی توقع بھی نہیں تھی کہ وہ خود اپنے راز دے دے گا۔ میں اُسے الٹا لٹکا کر اس کا سینہ رازوں سے خالی کر سکتا تھا، لیکن اس طریقے سے لیے ہوئے اقبالی بیان عدالت میں جا کر بے جان ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ باتیں گواہوں سے کہلوانی تھیں۔ اس ہندو لڑکے سے میں نے معلومات کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا۔ وہ نوجوان تھا۔ نیند نے اُسے ادھ مُرا کر دیا تھا۔ اُس میں غلط بیانی کی ہمت نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کانسٹیبلوں کے کمرے میں سونے کے لیے بھیج دیا۔

میری اپنی حالت بگڑ رہی تھی۔ سحر طلوع ہو رہی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اُس مسلمان لڑکی کے گھر کا پتہ بتایا جسے رگھوناتھ پریشان کرتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اس لڑکی کے چھوٹے بھائی کو ایسے طریقے سے ساتھ لے آئے کہ وہ گھبرائے یا ڈرے نہیں۔ اُسے کہنا کہ رگھوناتھ اور محسن کی جو لڑائی ہوئی تھی اس کے متعلق معلوم کرنا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو معلوم تھا کہ کون سے فرد کو کس طرح تھانے لایا جاتا ہے۔

میں ذرا آرام کے لیے چلا گیا۔

دس بجے کے بعد کا وقت تھا جب میں تھانے میں آیا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ ملزم کے ریمانڈ کا انتظام کرے۔ مسلمان لڑکی کا بھائی آ چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بلایا تو وہ اپنے خوف کو چھپا نہ سکا۔ وہ خوبصورت لڑکا تھا۔ رنگ سفیدی مائل گندمی تھا۔

عمر سولہ سے کم ہی ہوگی۔ میں نے سب سے پہلے اس کے دل اور ذہن سے خوف دُور کیا اور اُسے یہ تاثر دیا کہ میں مسلمان کی حیثیت سے اس کی بہن کی بے عزتی کا انتقام لوں گا۔ ایسی بہت سی باتیں کیں تو لڑکے کے چہرے کا اصل رنگ واپس آ گیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے جو بیان دیا وہ مختصراً اس طرح تھا کہ رگھوناتھ اور اس لڑکے کے مکان بہت قریب تھے۔ لڑکے کی بہن اپنی چھت پر جایا کرتی تھی۔ رگھوناتھ نے بھی

اپنی چھت پر چڑھنا شروع کر دیا۔

ایک روز بہن نے اپنے اس بھائی کو بتایا کہ وہ اُوپر جاتی ہے تو رگھوناتھ اُسے اشارے کرتا ہے اور نوٹ دکھاتا ہے۔ رگھوناتھ کو اپنے باپ کی دولت مندی پر ناز تھا۔ اُسے غالباً یہ توقع تھی کہ مسلمانوں کو روپے پیسے سے خریدا جا سکتا ہے۔ اُس نے اپنے مسلمان دوست کو بھی جھوٹا بیان دینے کے لیے ایک سو روپیہ پیش کیا تھا۔ اس لڑکی کی عزت کی حفاظت کرنے والا اس کا باپ تھا اور یہ بھائی جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے بعد دو بھائی بہت چھوٹے تھے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ رگھوناتھ شیر ہو گیا تھا۔ لڑکی کے بھائی نے اپنے باپ کو نہ بتایا۔ باپ بے چارہ پریشان ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ یہ درمیانہ درجے کا گھرانہ تھا۔ ایک روز اس لڑکے نے باہر کہیں رگھوناتھ سے کہا کہ ایسی حرکتیں نہ کیا کرے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے والے بدنام کرتے ہیں۔ رگھوناتھ نے بُرا منانے یا کچھ اور کہنے کی بجائے اس لڑکے کو دوست بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ لڑکے نے دوستی قبول نہ کی لیکن رگھوناتھ کے اتنے اچھے سلوک سے وہ متأثر ضرور ہُوا۔

کچھ دن بعد لڑکے کو اس کی بہن نے ایک ریشمی رومال دیا اور بتایا کہ وہ چھت پر گئی تو رگھوناتھ نے رومال کے ساتھ پتھر باندھ کر اُس کی طرف پھینکا ہے۔ لڑکا رومال لے کر رگھوناتھ کے پاس گیا اور رُومال پھاڑ کر اُس پر پھینک دیا۔ رگھوناتھ نے اُسے اپنا چھوٹا بھائی کہا اور اُسے پھانسنے کے کچھ دلکش طریقے اختیار کیے۔ پھر ایک روز رگھوناتھ نے لڑکی کی طرف رنگ پھینکے جو کانوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ لڑکی نے یہ بھی اپنے بھائی کو دے دیئے اور وہ رو پڑی۔ لڑکے نے یہ بھی رگھوناتھ کو دے دیئے۔ لڑکے نے اُسے دھمکی بھی دی۔ ایک روز لڑکے کو کسی نے بتایا کہ رگھوناتھ اس کی بہن کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔ لڑکا چونکہ چھوٹا اور اکیلا تھا اور رگھوناتھ بڑا اور اس کی نسبت طاقتور تھا

اِس لیے وہ اس ہندو سے ہاتھاپائی نہیں کرسکتا تھا۔

ایک روز لڑکی اور لڑکے کے باپ کے کان میں بھی کچھ باتیں پڑیں وہ ان کی ماں سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایک جوان بیٹا ہوتا تو اس ہندو کو میں زندہ نہ چھوڑتا۔ ماں بھی پریشان ہوگئی۔ لڑکا سُن رہا تھا۔ اس نے ماں اور باپ سے کہا کہ یہ ساری باتیں جھوٹی ہیں اور وہ اتنے پریشان نہ ہوں۔ اُس نے کہا —— "میں بھی تو جوان ہوں۔ میں انتقام لے سکتا ہوں" —— اُس کے بیان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتقام لینے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اُسے محسن ملا۔ اُس نے بڑے غور سے لڑکے کو الگ لے جاکر کہا —— "تمہیں اور تمہاری بہن کو اس ہندو سے بہتر کوئی آدمی نہیں ملا تھا؟ ساری قوم کی تم بے عزّتی کرا رہے ہو۔"

لڑکا رو پڑا۔ محسن کے غصّے میں ہمدردی تھی۔ لڑکے نے اُسے ساری بات سُنا دی۔ ریشمی رومال اور سونے کے رِنگوں کے متعلق بھی بتایا اور اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اکیلا ہوں اور چھوٹا ہوں، پھر بھی رگھوناتھ کو ختم کر دوں گا یا اس کا ایک بازو یا ٹانگ توڑ کر ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دوں گا۔ محسن نے اُسے کہا یہ کام میرا ہے تمہارا نہیں۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رگھوناتھ جو کچھ اس کرتا پھر رہا ہے وہ کہیں سچ تو نہیں۔ اب یہ مجھ پر چھوڑ دو۔

لڑکا اس قدر غصّے میں تھا کہ اُس نے محسن سے کہا "بھائی جان! اگر خون خرابہ کرنا ہے تو میں بھی ساتھ ہوں گا ورنہ مجھے چین نہیں آئے گا۔"

محسن لڑکے کے باپ سے ملا اور اُسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ ہم مر نہیں گئے۔ یہ ہندو آپ کے پاؤں میں سر رکھے گا۔ محسن اور رگھوناتھ دوست تھے۔ محسن نے لڑکی کے بھائی کو بتایا کہ اُس نے رگھوناتھ سے کہا ہے کہ مچھلی کے شکار کو چلتے ہیں اور وہ کل ندی پر جا رہے ہیں، وہ بھی آجائے۔ اُس نے لڑکے کو جگہ بتا دی۔ دوسرے دن لڑکا اُس جگہ پہنچ گیا۔ رگھوناتھ اور محسن بھی آگئے۔ دونوں نے کپڑے اتارے اور ندی

میں اُترنے لگے۔ وہ ایک دو ڈبکیاں لگا کر مچھلیاں پکڑنے والی کونڈیاں پھینکنا چاہتے تھے۔

ندی میں اترنے سے پہلے ہی محسن نے چاقو نکال لیا اور رگھوناتھ سے کہا —— "آج کے بعد اگر تم نے اس لڑکے کے ساتھ بات کی اور اس کی بہن کے متعلق کسی سے باہر بات کی تو اُسی رات قتل ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں ابھی قتل کرسکتا ہوں، لیکن دوستی کا لحاظ کرتا ہوں۔"

رگھوناتھ بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتا تھا۔ "ارے جا! تیرا میں خون پی جاؤں" —— اس نے کہا۔

محسن کے ہاتھ میں کھُلا ہُوا چاقو تھا جو وہ شاید استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے رگھوناتھ کا بازو پکڑ کر مروڑا اور دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ لڑکی کے بھائی نے پیچھے سے رگھوناتھ کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر پیچھے کو اٹھا دیں۔ اُوپر سے ہندو محسن پر گر پڑا۔ اُس وقت محسن کے چاقو کی نوک رگھوناتھ کے سینے پر لگی۔ وہ گرا۔ محسن نے گھٹنے اس کے سینے پر رکھ کر چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور کہا —— "تمہیں ذبح کر کے ندی میں پھینک دوں گا۔"

ہندو نے ہتھیار ڈال دیئے اور منتیں کرنے لگا۔ محسن نے اُسے خوب پیٹا اور اُس کے اُوپر سے اٹھ کر کہا —— "اس لڑکے کے پاؤں میں ناک رگڑو۔"

رگھوناتھ نے لڑکے کے پاؤں میں ناک زمین پر رگڑی۔

محسن نے اُسے کہا —— "اب کان پکڑ کر کہو کہ آئندہ اس گھر کے متعلق منہ سے کوئی بات نہیں نکالو گے۔"

اُس نے کان پکڑ کر یہ بھی کہہ دیا۔ اُس وقت دیکھا کہ رگھوناتھ کے سینے سے خون پھُوٹ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ سے پونچھا تو وہ ٹیڑھی سی خراش تھی جو چاقو کی نوک سے آئی تھی۔

اس کے بعد رگھوناتھ نے کوئی بیہودہ بات منہ سے نہ نکالی اور

اپنی چھت پر بھی نہیں چڑھا۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ محسن رگھوناتھ کی گولی سے مارا گیا ہے۔ معاملہ بالکل صاف تھا۔ رگھوناتھ کی بہت بےعزتی ہوئی تھی۔ اُس نے محسن کو پھر سے دوست بنا کر انتقام لیا تھا۔

مجھے رگھوناتھ کی بہن کی کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن میرے جذبات ایسے بھڑکے کہ میں نے اس مسلمان لڑکی کی بےعزتی کا انتقام لینے کے لیے رگھوناتھ کی بہن کو تھانے بلانے کا ارادہ کرلیا۔ میں ان کافروں کو پوری طرح ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے بُلایا تو اُس کا باپ بھی ساتھ ہی آ گیا۔ اُن کے ساتھ شہر کے سرکردہ ہندو بھی تھے۔ میں اس صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اُن کے احتجاج کو نظرانداز کرکے لڑکی کو دفتر میں بیٹھنے کو کہا اور ان ہندوؤں کو باہر کھڑا رہنے کی اجازت دے دی۔

میں نے لڑکی کے باپ کو الگ کرکے کہا کہ اس کیس میں تمہاری بیٹی کا بھی نام آتا ہے۔ مجھے شہادت مل گئی ہے کہ اس کے تعلقات محسن کے ساتھ تھے۔ اگر آپ مجھے پریشان کریں گے تو سارے شہر کو پتہ چل جائے گا کہ تمہاری بیٹی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔

وہ چُپ ہوگیا۔ جوان بیٹی باپ کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔

میں دفتر میں جاکر لڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ غیرمعمولی طور پر خوبصورت تھی۔ اُس نے باتیں کیں تو میں نے دیکھا کہ اُس کی زبان میں بھی اثر ہے۔

میں نے اُسے کوئی چکر نہ دیا۔ سیدھا کہا ——— "کیا تمہارے اور محسن کے تعلقات کا علم تمہارے بھائی کو بھی تھا؟"

وہ گھبرا گئی۔ دبی سی زبان سے اُس نے محسن سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

میں نے اُسے کہا ——— "جھوٹ سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہارا بھائی حوالات میں بند ہے۔ وہ عمر قید کے لیے جیل جا رہا ہے۔"

اُس کے آنسو نکل آئے۔

میں نے پوچھا ——— "یہ آنسو کس کے لیے ہیں..... بھائی کے لیے یا محسن کے لیے؟"

"دونوں کے لیے" ——— اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم محسن کے لیے مذہب بھی چھوڑنے کو تیار تھیں؟"

"ہاں!" ——— اُس نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا اور پوچھا ——— "محسن کو اتفاقیہ گولی لگی ہے یا میرے بھائی نے اُسے جان بُوجھ کر ماری ہے؟"

"میں یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں" ——— میں ابھی اُسے بتانا مناسب نہیں سمجھتا تھا ——— "تمہارے بھائی کو معلوم تھا کہ تم محسن سے ملتی ہو؟"

"نہیں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُس نے میرے ساتھ کبھی اس سلسلے میں بات نہیں کی تھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اُسے کسی سے پتہ چل گیا ہو اور اُس نے محسن کو مار ڈالا ہو۔"

"اگر تمہیں یہ بتایا جائے کہ محسن کو تمہارے بھائی نے دانستہ گولی ماری ہے تو تم اپنے بھائی کو بچانے کی کوشش کروگی؟"

"میں اس بدکار کو اپنے ہاتھوں پھانسی دوں گی" ——— اُس نے جواب دیا۔

اُس کے ساتھ جو طویل بات چیت ہوئی اس سے مجھے یہی حاصل ہُوا کہ وہ محسن کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اپنے بھائی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس نے رشتے سے انکار کیا تھا تو بھائی نے اُسے مارا پیٹا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس کا بھائی آوارہ اور بدکار ہے۔ شریف لڑکیوں کے پیچھے پڑا رہتا اور اُنہیں بدنام کرتا ہے۔ آخر میں اُس نے یہاں تک کہہ دیا ——— "اگر میرے بھائی نے محسن کو قتل کیا ہے تو مجھے بتانا۔ جو بیان پڑھاؤ گے عدالت میں وہی بیان دے دوں گی۔ محسن نہیں رہا تو اس کو بھی میرے سامنے زندہ نہ رہنے دو۔"

میں نے اسے رخصت کردیا۔ رگھوناتھ کو ابھی نہیں چھیڑا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اُس کا سات روز کا ریمانڈ لے لیا تھا۔ میں وقت گزارتا رہا۔ شام کو گھر چلا گیا۔ آدھی رات سے کچھ دیر بعد

تھانے میں آیا اور اُسے تفتیش کے مخصوص کمرے میں لے گیا۔ اس کا دم خم ختم ہو چکا تھا۔ تھانے اور حوالات کی دہشت عادی مجرموں کو ہی راس آتی ہے۔ جو وہاں پہلی بار جائے اُسے خدا یاد نہیں آتا بلکہ خدا بھول جاتا ہے۔ وہ تھانیدار کو ہی خدا اور کانسٹیبلوں کو فرشتے سمجھنے لگتا ہے۔ رگھوناتھ تو ماں باپ کا شہزادہ بیٹا تھا۔ اُسے جو کھانا دیا گیا تھا وہ اُس نے نہیں کھایا تھا۔ حوالات میں اُس وقت تین چرسی اور بھنگی بند تھے۔ یہ شہزادہ اُن کے ساتھ بند رہا تھا۔ تفتیش کے کمرے میں جا کر میں نے اُسے کہا کہ بیٹھ جاؤ تو وہ یوں بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔

"قمیض اتارو" ——— میں نے کہا۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے قمیض اُتار دی۔ اُس کے سینے پر ٹیڑھی خراش کا نشان ابھی موجود تھا۔ ایک ہی مہینہ پہلے محسن کے چاقو سے اُسے خراش آئی تھی۔

"یہ خراش کیسے آئی تھی؟" ——— میں نے پوچھا۔

اُس کا منہ کھُل گیا، بات نہ نکلی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے منہ بند کر لیا۔ خاموشی اُس کا جرم ثابت کر رہی تھی۔

"تم نے اس خراش کا انتقام گولی سے لیا" ——— میں نے کہا ——— "پکے راجپوت ہو۔"

"میں نے انتقام نہیں لیا" ——— اُس نے التجا کے لہجے میں کہا ——— "میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔"

"وہ اگر زندہ رہتا تو تم سے انتقام لیتا" ——— میں نے کہا ——— "اُس نے مرنے سے پہلے کہا تھا نا؟" وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا ——— "وہاں کوئی فاختہ نہیں تھی۔"

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ مجھے اچانک غصہ آ گیا۔ میں نے اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کر اس قدر زور سے مروڑے کہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"تم نے ایک شریف لڑکی کی طرف رومال اور رنگ پھینکے اور اُسے بدنام کیا" ——— میں نے کہا ——— "محسن تمہیں قتل کر سکتا تھا۔ تم نے اُسے دھوکے میں قتل کیا۔"

میں نے یہ جتنی باتیں کہی تھیں ان کا وہ اعتراف کر بھی لیتا تو عدالت میں اُسے کوئی نقصان نہ ہوتا نہ مجھے کوئی فائدہ ملتا لیکن تھانے میں ملزم کو صرف ایک ایسی بات کہہ دو جس کے متعلق اُسے امید ہو کہ کسی کو معلوم نہیں، تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اُسے تو میں نے بہت سی باتیں کہہ دی تھیں جنہیں وہ راز سمجھتا تھا۔

"کہو تو تمہارے جرم کی پوری کہانی سُنا دوں" ——— میں نے کہا ——— "لیکن مجھ سے سنو گے تو سیدھا پھانسی کے تختے پر لے جاؤں گا۔ اگر خود سُنا دو گے تو بچا لوں گا۔"

کچھ اور چکنی چُپڑی، کچھ دھمکی آمیز باتیں کہہ سُن کر میں نے اُسے اُس کے جرم کی تفصیل بھی سُنا دی تاکہ اسے شک نہ رہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا اگر وہ اقبالِ جرم کر لے تو میں اُسے کیا فائدہ دوں گا۔

"عدالت میں لے جا کر صاف بچا لوں گا" ——— میں نے وہی جھوٹ بولا جو میں ہر تفتیش میں بولا کرتا تھا۔ میں نے اُسے کہا ——— "میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں۔ کیس عدالت میں بھیج کر اپنی جان چھڑا لوں گا اور ایسا انتظام کروں گا کہ تم بھی باہر آ جاؤ گے۔ مجھے کیا۔ دو اور آدمیوں کو قتل کر دو۔"

بہرحال یہ پولیس کے جال ہوتے ہیں جو ملزم کی قسم کے مطابق استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ قسم جیسی تھی میں نے ویسا جال پھینکا اور اُس نے سب کچھ بتا دیا۔ اُس نے اُن بیانات کی تصدیق کی جو میں دیہاتیوں اور دونوں لڑکوں سے لے چکا تھا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ وہ اُس مسلمان لڑکی کے پیچھے پڑا رہا ہے۔ اُس نے رومال اور رنگ پھینکے تھے اور اُس نے لڑکی کو بلاوجہ بدنام کیا تھا۔ لڑکی نے

اُس کی طرف کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ محسن نے اُسے مارا پیٹا اور اُس کی شہ رگ پر چاقو رکھ دیا تھا۔ اُس نے لڑکے کے پاؤں میں ناک رگڑنے اور کان پکڑنے کا بھی اعتراف کیا اور کہا کہ اُس نے اُسی وقت انتقام کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ دھوکے سے وار کرنا چاہتا تھا۔ اُسے محسن دھوکے میں مچھلی کے شکار کے لیے لے گیا۔ رگھوناتھ نے بھی شکار کا دھوکا دینے کا ارادہ کیا۔

اُس نے لڑکوں کے بیان کے مطابق بتایا کہ اُن کی مدد سے اُس نے محسن کے ساتھ پھر دوستی کر لی۔ اُس سے معافی مانگی اور ایک روز اُس کے کہنے سے چاروں شکار کو گئے۔ تھوڑے سے پرندے مارے۔ پھر موقعۂ واردات پر اُس نے دیکھا کہ مسلمان لڑکا پانی پینے چلا گیا ہے تو اُس نے ہندو لڑکے کو خشک ٹہنیاں لانے کے بہانے دُور بھیج دیا۔ وہاں کوئی خشک ٹہنی نہیں تھی۔ وہ بھی چلا گیا تو رگھوناتھ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے محسن سے کہا کہ اُس کے نیچے جا کر دیکھو۔ کبوتر یا فاختہ کا جوڑا آ کر بیٹھا ہے۔ محسن اُدھر چلا گیا۔ کچھ دُور گیا تو پیچھے سے رگھوناتھ نے اُس پر فائر کر دیا۔ انسان کو مارنے کے لیے بڑا مضبوط دل گُردہ چاہیے۔ فائر کرتے رگھوناتھ کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس لیے چھرّے دائیں پہلو میں جا لگے تھے۔ اُس نے نشانہ سرکا لیا تھا۔

وہ گرا تو رگھوناتھ نے شور مچا دیا اور دونوں لڑکوں کو بتایا کہ اُسے غلطی سے گولی لگ گئی ہے۔ وہ اسی مقصد کے لیے یعنی گواہی کے لیے اِن دونوں لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے بیان دیا کہ محسن مرتا نہیں تھا۔ وہ محسن کو گاؤں تک لے جا سکتا تھا لیکن نہ لے گیا۔ مسلمان دوست کو اُس نے پانی لانے کے لیے بھیج دیا اور ہندو سے کہا کہ سالا مسلمان ہے مرنے دو۔ پھر محسن بے ہوش ہو گیا تب اُس نے ہندو سے کہا کہ گاؤں میں جاؤ اور چارپائی لاؤ۔ چارپائی آنے

تک وہ زندہ تھا۔ پھر مر گیا۔

"اِس قتل سے تمہیں ایک فائدہ ہُوا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اب تمہاری بہن اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان نہیں ہو گی۔"

اُس نے حیران سا ہو کر مجھے دیکھا، لیکن میں نے اُسے اور کچھ نہ بتایا۔

اقبالِ جرم مجسٹریٹ قلمبند کیا کرتا ہے۔ اس کے لیے قانون میں ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ ہے۔ ملزم کو مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ مجسٹریٹ اُسے اپنے کمرے میں بٹھا کر کہتا ہے کہ وہ اس فیصلے میں آزاد ہے کہ اقبالِ جرم کرے یا نہ کرے۔ اگر نہ کرے تو بتا دے۔ اس صورت میں ملزم کو پولیس کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ جیل کی حوالات میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مقدمہ عدالت میں جاتا ہے اور یہ فرض پولیس کا ہے کہ اقبالِ جرم کے بغیر جرم ثابت کرے۔

میں رگھوناتھ کو مجسٹریٹ کے پاس لے گیا۔ چار گھنٹے بعد مجسٹریٹ نے مجھے بُلا کر بتایا کہ ملزم نے کہا ہے کہ آپ نے تھانے میں اُس پر تشدّد کیا ہے جس سے گھبرا کر اُس نے اُوٹ پٹانگ بیان دے دیا تھا۔ وہ اب اقبالِ جُرم ریکارڈ کرانے سے انکار کرتا ہے۔

میرے ساتھ ایسے کبھی نہیں ہُوا تھا، لیکن یہ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ میرے اے۔ ایس۔ آئی نے رگھوناتھ کے باپ کو بتا دیا تھا کہ میں کون سے مجسٹریٹ کے پاس جا رہا ہوں۔ قصبے میں کوئی مجسٹریٹ نہیں تھا۔ مجھے ضلع کے شہر میں جانا تھا جہاں دفعہ ۳۰ کے مجسٹریٹ تھے۔ رگھوناتھ کا باپ وہاں جا پہنچا اور مجسٹریٹ نے اس کے لڑکے کو بچانے کا بندوبست کر دیا، مگر یہ ہندوؤں کی بھول تھی۔ میں نے اقبالِ جرم پر ہی بھروسہ کبھی نہیں کیا تھا۔ میری شہادت کافی تھی۔

گواہ مضبوط تھے۔ سیشن جج ایک اینگلو انڈین تھا۔ بڑا ہنگامہ خیز مقدمہ تھا۔ سیشن کورٹ نے عمر قید کی سزا سنا دی جو ہائی کورٹ نے اپیل میں سات سال کر دی۔

★ ★

جب کالا برقعہ جل رہا تھا

یہ واردات بھی مسلمانوں کی ہی تھی۔ وہی عورت کا چکّر اور عشق بازیاں جو معلوم نہیں مسلمانوں کے ہی حصے میں کیوں آئی ہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ دیکھو تو عورت کی زلفوں کے اسیر، گدا دیکھو تو عورت کے تصوّر میں مست۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کے جیل خانوں میں رونق مسلمانوں کے دم قدم سے تھی۔ عورت کی خاطر جو مسلمان قتل ہوتے اور پھانسی چڑھے ہیں، ان کی تعداد تمام قوموں کے مقتولین اور سزا یافتہ کی مجموعی تعداد سے یقیناً دُگنی ہو گی۔

میں قصبے کے تھانے میں بیٹھا کسی کیس میں اُلجھا ہُوا تھا۔ ایک آدمی عمر پچیس سال کے لگ بھگ، میرے دفتر میں آیا اور رپورٹ دی کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے۔ اُسے لاپتہ ہُوئے ایک دن اور دو راتیں گزر گئی تھیں۔

ایک ہی سال پہلے اُن کی شادی ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی یا اغوا ہو گئی تھی۔ اتنی دیر بعد رپورٹ دینے کی وجہ خاوند نے یہ بتائی کہ شاید لڑکی آ جائے۔ میں نے اُسے سب سے پہلے یہی بات صاف کرنے کو کہا کہ اُس نے یہ اُمید کیوں لگائی تھی کہ شاید وہ آ جائے؟ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی گھریلو تنازعہ یا خاوند کے ساتھ چپقلش کے باعث رُوٹھ کر چلی گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔

عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ خاوند نے بتایا کہ وہ اُسے تلاش کرتا رہا۔ اُس کے ماں باپ کے گھر سے پتہ کیا۔ وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ وہ چونکہ شام کے بعد لاپتہ ہوئی تھی، اس لیے رات کے وقت اُس کی سہیلیوں کے گھروں سے پتہ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے آپ کو بدنام کرنے والی بات تھی۔ دوسرے دن سہیلیوں سے معلوم کیا، وہ کسی کے ہاں نہیں گئی تھی۔ پھر رات ہو گئی اور یہ لوگ سوچتے رہے کہ تھانے رپورٹ دیں یا نہ دیں۔ انہیں اپنی عزت کا زیادہ خیال تھا۔ خاوند کو سو فی صد یقین تھا کہ اُس کی بیوی اپنی مرضی سے نہیں گئی۔

خاوند نے جب یہ بتایا کہ اُس کی ماں سوتیلی ہے تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے اُس سے پوچھا ——— "تمہاری سوتیلی ماں کی عمر کیا ہوگی؟"

"شاید تیس سال ہوگی" ——— اُس نے جواب دیا۔

"اور باپ کی عمر؟"

"وہ تو بوڑھے ہو گئے ہیں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "ساٹھ سال کے قریب ہوں گے۔"

ہمارے معاشرے میں سوتیلی ماں ایک خطرناک کردار ہے۔ سوتیلی ماں کو ظالم سمجھا جاتا ہے اور اگر سوتیلی ماں جوان اور اُس کا خاوند بوڑھا اور اس خاوند کا کوئی بیٹا جوان ہو تو وہاں پُورن بھگت کا قصّہ دُہرایا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پُورن بھگت کی سوتیلی ماں اُسے دل دے بیٹھی تھی۔ پُورن اُس کے ہاتھ نہ آیا تو اُس نے پُورن کے باپ سے جو اُس نگری کا راجہ تھا، یہ شکایت کی کہ اُس کے جوان بیٹے نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ باپ نے راجہ کی حیثیت سے بیٹے کو یہ سزا دی کہ اُس کے دونوں ہاتھ کٹوا کر اُسے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

پولیس کی فائلوں میں آپ کو پُورن بھگت ایسے بہت

سے کیس ملیں گے اور ایسے کیس بھی ملیں گے کہ جوان بیٹا سوتیلی ماں کو بھگا لے گیا اور اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ ایسی وارداتوں کی بھی کمی نہیں کہ جوان بیٹوں نے جوان سوتیلی ماؤں کے ساتھ مل کر باپوں کو قتل کرا دیا۔ جوان سوتیلی مائیں سوتیلے بیٹوں کی بیویوں کو اپنا رقیب سمجھ لیتی ہیں۔

اس لڑکی کی گمشدگی میں بھی ایک سوتیلی ماں کا نام سُن کر میں نے مناسب سمجھا کہ اس آدمی کے گھر جا کر معلومات حاصل کی جائیں اور اُس کے مطابق رپورٹ درج کی جائے۔ میں دراصل سوتیلی ماں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ چونکہ وہ مسلمان تھی، اس لیے میں اُسے تھانے میں بلانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے گمشدہ لڑکی کے خاوند کو کچھ دیر کے لیے بٹھا لیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی پریشانی کا آپ تصوّر کر سکتے ہیں۔

نصف گھنٹے کے بعد میں فارغ ہُوا۔ گھر جا کر وردی اُتاری اور اپنے کپڑے پہن کر اُس کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔ سب سے پہلے اُس کی سوتیلی ماں کو دیکھا۔ پھر اُس کے باپ کو دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اُس عورت کا خاوند نہیں باپ ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلا بیٹا بہن بھائی لگتے تھے۔ باپ تو کچھ تھا ہی بوڑھا، بہو کی گمشدگی نے اُسے اور زیادہ جھکا دیا تھا۔ میں نے باپ بیٹے سے باتیں کرنے کے لیے انہیں الگ کمرے میں بٹھا لیا۔ ابھی یہ نہیں پُوچھا تھا کہ وہ کس وقت گھر سے نکلی، کیسے نکلی اور کیا کہہ کر گئی یا بتا کر گئی تھی یا نہیں۔ میں نے گمشدہ لڑکی کے خاوند سے پوچھا ——— "گھر میں سوتیلی ماں کا سلوک اور رویّہ کیسا ہے؟"

"وہ بہت اچھا" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُس کا سلوک سگی ماؤں جیسا ہے۔"

بوڑھے نے اپنی بیوی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اُس نے کہا

——— ”میری ایک بیٹی شادی شدہ ہے۔ تین بچوں کی ماں ہے۔ وہ جب یہاں آتی ہے تو میری بیوی اُس کی سوتیلی ماں ہوتے ہوئے اتنا اچھا سلوک کرتی ہے کہ سگی ماں کیا کرے گی۔ اُسے واپس جانے ہی نہیں دیتی۔“

”آپ کو شائد یقین نہیں آئے گا کہ کوئی سوتیلی ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے“ ——— گمشدہ لڑکی کے خاوند نے کہا۔ اس آدمی کو میں کہانی سُنانے کی سہولت کے لیے ساجد کہوں گا۔ صحیح نام لکھنا مناسب نہیں۔ ساجد نے کہا ——— ”میں اپنی ماں کو بھول گیا ہوں۔“

اُس نے اپنے باپ کی طرح سوتیلی ماں کی بہت تعریف کی۔ میں نے اُن کے الفاظ پر دھیان دینے کی بجائے اُن کے چہروں کو زیادہ پڑھا۔ بوڑھے کے چہرے پر بے بسی تھی جیسے وہ ہار گیا ہو اور اب الفاظ میں ہار کو جیت میں بدلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسری شادی جو اُس نے بڑھاپے میں جوان عورت سے کی تھی، ایک غلطی تھی جس پر وہ پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بیٹے ساجد کے چہرے کے تاثرات باپ سے جدا تھے جو بتا رہے تھے کہ ایک جوان آدمی ایک ایسی جوان عورت کی تعریف کر رہا ہے جسے وہ ماں یا بہن نہیں سمجھتا۔

میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ ساجد اپنی بیوی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ کیا سوتیلی ماں نے درمیان میں آکر دونوں میں غلط فہمی اور ناچاقی پیدا کر دی تھی؟

”کیا تمہاری بیوی گھر میں خوش رہتی تھی؟“ ——— میں نے پوچھا۔

باپ بیٹے نے اکھٹے ہی جواب دیا اور مجھے یقین دلانے کی بڑی سخت کوشش کی کہ وہ خوش رہتی تھی اور ساس اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی تھی۔

”خدا کرے کہ وہ مل جائے“ ——— ساجد نے کہا ——— ”وہی آپ کو بتا سکتی ہے کہ میری سوتیلی ماں کا اس کے ساتھ سلوک کتنا پیارا تھا۔“

”دراصل جی!“ ——— بوڑھے نے کہا ——— ”میری یہ دوسری بیوی کوئی بھاگوان روح ہے۔ اس کی (ساجد کی) ماں کو اللہ جنّت بخشے، اچھی عورت تھی، لیکن اس دوسری بیوی نے میرے گھر کو جنّت بنا دیا ہے۔ آپ سارے محلّے سے پوچھ لیں۔ ساجد کے سسرال سے پوچھ لیں۔“

”دوسری شادی کب کی ہے؟“ ——— میں نے پوچھا۔

”پہلی بیوی کو مرے اڑھائی سال ہو گئے ہیں“ ——— بوڑھے نے جواب دیا ——— ”دوسری شادی کیے ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔“

”اسی شہر کی رہنے والی ہے؟“

”نہیں“ ——— اس نے قصبے سے تین میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا کہ وہاں کی رہنے والی ہے۔

”بیوہ تھی یا غیر شادی شدہ؟“

”بیوہ ہو گئی تھی“ ——— بوڑھے نے جواب دیا ——— ”آپ جانتے ہیں کہ عورت جوانی میں بیوہ ہو جائے تو لوگ اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی بجائے اُسے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی سُلوک اس عورت کے ساتھ ہُوا۔ یہ بیچاری دوسری شادی کرنا چاہتی تھی مگر گاؤں والوں نے مشہور کر دیا تھا کہ بدکار ہو گئی ہے۔ کوئی اسے قبول نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک دوست اُس گاؤں میں رہتا ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہ نیکی کا کام ہے۔ اس عورت کو شہر لے جاؤ اور نکاح پڑھا لو۔ میں نے اُس کی بات مان لی اور یہ نیکی کی کہ اسے گھر میں آباد کر لیا۔ اس نے مجھے ایک منٹ کے لیے بھی کبھی پریشان نہیں کیا۔“

”ایک بات اور بتاؤں“ ——— ساجد نے کہا ——— ”میری بیوی کی ماں مر چکی ہے۔ شادی کے بعد میری سوتیلی ماں نے اس کے لیے سگی ماں کی کمی پوری کر دی۔ آپ میرے سسرال جا کر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ساجد کی شادی شدہ بہن اپنے بچّوں
کے ساتھ آگئی۔ وہ ساجد کی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع پر آئی تھی۔ مجھے
پتہ چلا تو میں نے اُسے اندر بلالیا اور سوتیلی ماں کے متعلق اُس کی
رائے لی۔ اُس نے اپنے باپ اور بھائی سے بڑھ چڑھ کر تعریفیں کیں۔
میں قائل ہو گیا کہ یہ ماں اچھی ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ سوتیلی ماں
کا کردار سنگین وارداتوں کا موجب بنتا ہے، اس لیے میں شک
رفع کرنا چاہتا تھا کہ گمشدگی یا اغوا کی اس واردات میں سوتیلی ماں کا
ہاتھ تو نہیں۔ یہ لوگ تو اُس کے مُرید بنے ہوئے تھے۔ ساجد کی نوجوان
بیوی گم ہو گئی تھی۔ اُسے ذرا سے شک کا تو اظہار کرنا چاہیے تھا، مگر
اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کی گمشدگی برداشت کر سکتا ہے
سوتیلی ماں کے خلاف کوئی الزام برداشت نہیں کرے گا۔
میں نے اُن سے پوچھا کہ لڑکی کب اور کس طرح گھر سے نکلی
ہے؟ بوڑھے نے کہا کہ اس کی بیوی بتا سکتی ہے۔ وہ اُسی کو
کچھ بتا کر شام کے وقت گھر سے نکلی تھی۔

سوتیلی ماں کی کشش

میں نے انہیں یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ اُسی کو اندر بھیج دیں۔ وہ
آئی تو میں نے اُسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اُس کے چہرے پر گہری اُداسی
تھی اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔
"لڑکی کس وقت گھر سے نکلی تھی؟" ـــــ میں نے اُس سے پوچھا۔
"شام کا کھانا کھا کر" ـــــ اُس نے غم سے دبی ہوئی
آواز میں جواب دیا۔ اُس کے بولنے میں ذرّہ بھر طاقت یا جان
نہیں تھی۔
میں نے اُس کے چہرے کا گہرا جائزہ لیا۔ اُس کی جسمانی ساخت

یعنی ڈیل ڈول کو گہری نظر سے دیکھا۔ چہرے دھوکہ بھی دیا کرتے ہیں۔
بڑے بڑے ماہر چہرہ شناس دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ پیشہ ور ڈاکو پر
شک ہو سکتا ہے کہ زاہد اور خدا ترس ہے، مجرم نہیں اور کسی زاہد
کا چہرہ ایسا ہوتا ہے کہ بدکار اور مجرم لگتا ہے۔ پھر بھی بال سے زیادہ
باریک ایک فرق ہوتا ہے جو آنکھ کو نظر آجائے تو کھرا کھوٹا معلوم ہو
جاتا ہے۔
اس عورت کے متعلق مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ محبّت کرنے والی
نیک عورت ہے۔ گاؤں والوں نے اُسے بلاوجہ بدنام کر دیا تھا۔
میں نے اُس کے چہرے مہرے پر وہ رنگ صاف دیکھے جو کسی عورت کی بدنامی
کا باعث بنتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ گناہگار ہو۔ یہ عورت غیر معمولی
طور پر خوبصورت نہیں تھی۔ اُس کا رنگ گندمی اور سفید کے بین بین
تھا، گندمی غالب تھا۔ اس کے جسم کی بناوٹ میں اور چہرے کے
نقش و نگار میں ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کی نظروں کو اس کے جسم
کی طرف لے جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی جو اداسی
کے باوجود نمایاں تھی۔ اُس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے سامنے کے
تین دانت ذرا ذرا سے نظر آتے تھے۔ اس سے ہونٹ مُسکراتے لگتے
تھے۔ مختصر یہ کہ اس عورت کے چہرے اور جسم میں ایسی کشش تھی جو پاک
محبّت کی بجائے حیوانی جذبے کی طرف لے جاتی تھی۔ یہ عورت
شگفتہ مزاج اور زندہ دل معلوم ہوتی تھی۔ وہ نیک پاک ہو سکتی تھی
لیکن میں اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔
"مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہ گھر سے کس طرح نکلی تھی؟"
"وہ شام کا کھانا کھا چکی تو کمرے میں چلی گئی" ـــــ اُس
نے جواب دیا ـــــ "میں باورچی خانے میں تھی۔ وہ میرے پاس
آئی۔ اُس نے بُرقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ کہنے لگی، امّی! میں ابھی آتی ہوں،
سویٹر کا ایک نمونہ لانا ہے۔ میں نے نہیں پوچھا کہ نمونہ کس کے گھر

سے لائے گی۔ اُس نے بتایا بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چلی گئی کہ ابھی آتی ہوں۔ پھر وہ واپس ہی نہیں آئی۔"

"تم نے کیوں نہیں پوچھا تھا کہ نمونہ کہاں سے لائے گی؟" — میں نے پوچھا — "جوان لڑکی کا رات کے وقت باہر جانا ٹھیک نہیں تھا۔"

"مجھے اس لڑکی پر بھروسہ ہے" — اُس نے جواب دیا — "وہ کئی بار اسی وقت سہیلیوں کے گھر گئی تھی۔ بعض اوقات ضد کر کے مجھے بھی ساتھ لے جاتی تھی۔ میرے ساتھ اُس کا سہیلیوں والا پیار تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے یہ لڑکی میرے گھر میں آئی ہے، میرے لیے رونق پیدا ہو گئی ہے۔"

"وہ خاوند سے خوش تھی؟"

"پوری طرح خوش۔"

"تم اتنے بوڑھے خاوند سے خوش ہو؟"

اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس مسکراہٹ سے اس کی اُداسی ختم ہو گئی۔ اُس نے کہا — "آپ انہیں بوڑھا سمجھتے ہوں گے، میرے لیے یہ بوڑھے نہیں۔ میں ان سے ہر لحاظ سے خوش اور راضی ہوں۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ جو اور زیادہ کھِل گئی تھی، بتاتی تھی کہ وہ باریک اشارے سمجھ سکتی ہے۔

"یہ لوگ تمہارے سلوک کی بہت تعریف کرتے ہیں" — میں نے کہا — "ساجد تو تمہارا غلام معلوم ہوتا ہے۔"

"ہماری عمر میں چار پانچ سال کا فرق ہے، لیکن میں اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔"

"سنا ہے گاؤں میں لوگوں نے تمہیں بدنام کر دیا تھا" — میں نے کہا — "انہیں ایسا شک کیوں ہوا تھا؟"

"خاوند کی موت کا غم کسے نہیں ہوتا؟" — اُس نے کہا۔ "لوگوں نے یہ تو نہیں دیکھا کہ میری راتیں روتے گزر جاتی ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ میں مسکراتی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ہنستی مسکراتی تھی لیکن کوئی بھی نہ جان سکا کہ میں غم کو دبانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میری اس عادت نے مجھے بدنام کیا ہے کہ شوخیاں اور شرارتیں پسند کرتی ہوں اور ہنسی مذاق کی بھی عادت ہے۔ گاؤں میں عورتوں کے شکاری بھی ہیں۔ انہوں نے میرے مسکراتے چہرے اور جوانی کی بیوگی سے دھوکہ کھایا اور جال پھینکنے لگے۔ کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ آؤ میرے ساتھ شادی کر لو۔ وہ مجھے بن بیاہی بیوی بنانا چاہتے تھے۔ میں نے اُن کے شک رفع کر دیئے۔ دو کو دُور سے جوتی اتار کر دکھائی۔ مجھے اغوا اور زبردستی خراب کرنے کی دھمکیاں بھی ملیں۔ میرا بھائی کوئی نہیں۔ تین بہنیں ہیں۔ ماں مر گئی ہے اور باپ بوڑھا ہے۔ میں مرد بن گئی اور کسی کے جال میں نہ آئی، مگر میرے ہنسی مذاق نے اور ان لوگوں نے جنہیں میں نے جوتی دکھائی تھی مجھے بدنام کر دیا۔ ایسی ایسی کہانیاں مشہور کیں کہ میں چکرا گئی۔ بوڑھے باپ کی رُسوائی ہوئی۔ اُس نے مکھیا سے کہا کہ میری شادی کرا دے، مگر جس کے ساتھ بات ہوئی اُس نے کہا لڑکی خراب ہے۔ کسی کی معرفت ان (موجودہ خاوند) سے بات ہو گئی اور نکاح ہو گیا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ یہ بوڑھا ہے؟"

"اچھی طرح معلوم تھا" — اُس نے جواب دیا — "میرے ساتھ کسی نے دھوکہ فریب نہیں کیا۔ اگر آپ میری بات کو سچ مانیں تو یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ مردوں سے مجھے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ میرے لیے جوان اور بوڑھے میں کوئی فرق نہیں رہا۔ میں تو بدنامی اور رُسوائی سے پناہ مانگ رہی تھی۔ میرے لیے اب جسم کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ جس

کے ساتھ میرا نکاح پڑھایا جا رہا ہے وہ مجھ سے دُگنی عمر کا آدمی ہے، خوشی اور رضامندی سے اُسے قبول کیا۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ اس گھر میں کتنی اولاد ہے؟"

"ہاں!" ___ اُس نے جواب دیا ___ "میں نے پوچھا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک جوان بیٹا ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ گھر میں جوان بیٹا ہے" ___ میں نے کہا۔

"ہاں جی!" ___ اُس نے جھجک کے بغیر کہا ___ "ساجد کا مجھے علم تھا۔"

"جوان بیٹے سوتیلی ماں کو عموماً پسند نہیں کیا کرتے" ___ میں نے کہا ___ "ساجد نے تمہیں ماں کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا؟"

"پہلے روز ہی" ___ اُس نے گردن کو خم دے کر جواب دیا ___ "میں نے اسے دل سے قبول کیا ہے تو وہ مجھے کیوں نہ کرتا؟"

میں نے اُس کے اس جواب اور انداز کو ذہن میں محفوظ کر لیا، لیکن اس عورت کے متعلق میں کوئی ایسی رائے قائم نہ کر سکا جو اس کے خلاف شک پختہ کرتی۔ مجھے اس کے چہرے مہرے سے شک ہُوا تھا، مگر میرے سامنے کوئی مضبوط جواز نہیں آیا تھا۔

"تمہاری بہو اور سہیلی لاپتہ ہو گئی ہے" ___ میں نے کہا ___ "تم دونوں میں رازداری بھی ہو گی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتا دو۔ مجھے شک ہے کہ وہ اپنے خاوند سے خوش نہیں تھی اور اُس کا دل کہیں باہر تھا۔ وہ جسے چاہتی تھی اُس کے ساتھ نکل گئی ہے۔ اُس نے تمہیں ضرور بتایا ہو گا۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو میں اُس کی ٹانگیں توڑ دیتی" ___ اُس نے جواب دیا اور سوچ میں پڑ گئی۔ میں اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ معمولی سی تبدیلی نظر آئی۔ اُس نے کہا ___ "لیکن کسی کے

دل کا سارا حال کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اگر میرا سلوک بُرا ہوتا تو لوگ کہتے کہ میرے بُرے سلوک سے بھاگی ہے۔ آپ سارے محلّے سے پوچھ لیں کہ میرا سلوک کیسا تھا۔ وہ اپنے خاوند سے بھی خوش تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ شادی اُس کی اپنی پسند کی تھی۔"

"وہ پیسے یا زیورات لے گئی ہو گی؟"

"نہیں" ___ اُس نے جواب دیا ___ "یہ میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں لے گئی۔ برقعے میں گئی ہے۔"

"برقعے کا رنگ کیا ہے؟"

"سیاہ۔ نئے فیشن کا۔"

"تمہاری اور ساجد کی آپس میں بے تکلّفی تھی" ___ میں نے کہا ___ "تم اکٹھے بیٹھا کرتے تھے۔ مجھے شک ہے کہ لڑکی نے تمہاری اور ساجد کی محبّت کو غلط سمجھ لیا تھا۔ تم بھی آخر جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے یا ساجد کو ضرور بتاتی" ___ اُس نے جواب دیا ___ "شکایت کرتی یا ناراضگی کا اظہار کرتی۔"

"تم دونوں کی محبّت ماں بیٹے والی تھی" ___ میں نے اس پر الزام عائد کیے بغیر کہا ___ "پھر بھی تمہیں احتیاط کرنی چاہیئے تھی۔"

لڑکی کا محبّت نامہ

اُس نے بے معنی سا جواب دیا جو ادھورا بھی تھا۔ اُس کے چہرے پر معمولی سی تبدیلی بھی آئی۔ میں اُس سے اس مرحلے میں اور کچھ نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔ اُسے ابھی صرف سونگھا تھا۔ مجھے اس مرحلے میں یہ تین افراد دیکھنے تھے ___ بوڑھا شوہر، جوان بیٹا،

جوان سوتیلی ماں ——— یہ تین کردار جہاں اکٹھے ہو جائیں وہاں جھوٹ بھی سچ ہو جاتے ہیں۔ مجھے تین سوالوں کے جواب درکار تھے ——— کیا یہ جوان عورت جو جوانی کے عروج پر ہے اس خاوند سے مطمئن ہے جو بڑھاپے کے عروج میں داخل ہو رہا ہے؟ کیا یہ جوان آدمی سوتیلی ماں کو سگی ماں سمجھتا ہے؟ کیا ساجد اور اس کی لاپتہ بیوی میں ناچاقی تھی اور کیا اس کا باعث سوتیلی ماں تھی؟

ایسے سوالوں کے جواب اِن کرداروں سے نہیں ملا کرتے۔ وہ صرف جرح اور سوال در سوال سے نہیں بتایا کرتے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ سُنی سُنائی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معمّے تھانیداروں کو اپنی عقل اور فہم و فراست سے حل کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا انحصار تھانیدار کے سوالوں پر ہوتا ہے۔ اگر سوال دانشمندی اور چالاکی سے کیے جائیں تو نہایت واضح اشارے ملتے ہیں۔ بہرحال تفتیش کا یہ مرحلہ بہت مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر پولیس انسپکٹر اس کاوش سے گھبراتے ہیں۔ وہ مخبروں، وعدہ معاف گواہوں اور تشدّد سے اگلوائی ہوئی باتوں سے کیس تیار کرتے ہیں۔

میں وعدہ معاف گواہ بنانے سے ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک جرم میں ایک سے زائد افراد ملوث ہیں۔ آپ نے انہیں مشتبہ کی حیثیت سے تھانے بلا لیا ہے۔ وہ اقبالِ جرم نہیں کر رہے۔ آپ تفتیش سے بچنا چاہتے ہیں تو قانون نے آپ کے لیے یہ سہولت پیدا کر رکھی ہے کہ سب پر بے رحمی سے تشدّد کرو اور ایک سے کہو کہ وعدہ معاف گواہ بن جاؤ، یعنی تم اقبالِ جرم کر کے سب کے خلاف کورٹ میں گواہی دو تو تمہیں بخش دیا جائے گا۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ ایک مجرم جو قتل یا ڈاکے یا ملک کے خلاف جاسوسی کرتے پکڑا جاتا ہے بخشا جاتا ہے۔ اُسے کھُلی چھٹی مِل جاتی ہے کہ آئندہ بھی جرم کرے اور پکڑا نہ جائے۔ میں کسی کو بخشنے پر

آمادہ نہیں ہُوا کرتا تھا۔ وعدہ معاف گواہ صرف اُس کیس بنایا جاتا ہے جس کی نہ شہادت ملے نہ کوئی ثبوت، یعنی انتہائی دشوار کیسوں میں جہاں انسپکٹر کو یقین ہو کہ اُس نے صحیح ملزم پکڑے ہیں مگر انہیں سزا دلانے کے لیے ثبوت اور شہادت ناکافی ہے۔ آج کل کیسوں کا انحصار چار چیزوں پر ہے۔ مُخبر، غیر انسانی تشدّد (تھرڈ ڈگری) اقبالِ جرم اور وعدہ معاف گواہ۔ ان سے تھانیدار کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ تھانے میں بیٹھے بیٹھے تفتیش مکمل ہو جاتی ہے۔

مجھے کچھ ایسا شک ہو رہا تھا کہ اس لڑکی کے اغوا میں دو سے زیادہ افراد ملوث ہیں مگر یہ خیال بھی آتا تھا کہ لڑکی کسی آشنا کے ساتھ ہی نہ نکل گئی ہو۔ میں نے لڑکی کا ٹرنک دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میں نے صرف خاوند کو ساتھ رکھا اور ٹرنک کھولا۔ لڑکی کے کپڑوں سے بھرا ہُوا تھا۔ میں نے تمام کپڑے باہر نکالے۔ نیچے سے ایک کاغذ نکلا۔ یہ کسی آدمی کا لکھا ہُوا محبت نامہ تھا۔ کھُلے الفاظ میں محبّت کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں یہ فقرہ لکھا تھا۔ ”خدا ہمیں وہ دن جلدی دکھائے گا جب ہم ایک جان ہو جائیں گے“ نیچے نام نہیں لکھا تھا۔ پان کے پتّے کی طرح دل بنا ہُوا اور اُس میں سے تیر گزرا ہُوا تھا۔ تاریخ لکھی ہوئی تھی جو شادی سے دو مہینے پہلے کی تھی۔

میں خوش ہُوا کہ مجھے ایک سوال کا جواب مل گیا ہے مگر ساجد نے یہ کہہ کر مجھے مایوس کر دیا ——— ”یہ میرا رقعہ ہے۔ میں نے اسے شادی سے پہلے لکھا تھا۔“

اُس نے بتایا کہ اُس نے لڑکی کو اور لڑکی نے اُسے شادی سے پہلے پسند کر لیا تھا۔ لڑکی نے ساجد کی شادی شدہ بہن کے گھر آنا جانا شروع کر دیا اور ساجد سے وہاں ملاقاتیں کرتی تھی۔ یہ خیال رہے کہ یہ درمیانے درجے کے گھرانے تھے۔ کسی ہیلو ایڈوانس نہیں تھے۔ میں نے ساجد سے پوچھا کہ یہ خط اُس نے لڑکی تک کس طرح پہنچایا تھا؟ بذریعہ ڈاک

یا کسی کے ہاتھ؟

"وہ کسی کے ہاتھ بھیجا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

میں نے یہ سوال کسی مقصد کے تحت کیا تھا۔ میں نے رقعہ لے جانے والے کا نام اور اتا پتا پوچھا تو وہ پس و پیش کرنے لگا۔ میرے اصرار اور تسلی پر اُس نے محلے کی ایک عورت کا نام لیا۔ میں نے اُس کے گھر کا پتہ بھی اُس سے معلوم کر لیا اور اُس پر یہ ظاہر کیا کہ اس عورت کا اس کیس اور میری تفتیش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ رقعہ اُسے واپس کر دیا۔ لڑکی کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کی کہ سیدھی سادی نہیں۔

میں ساجد کو ساتھ لے کر اُس کے سسرال یعنی گمشدہ لڑکی کے میکے گھر چلا گیا۔ وہاں لڑکی کا باپ ملا۔ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ساجد سے پوچھا ـــــ "کچھ پتہ چلا؟" ـــــ پھر اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ایک ہی تھانہ تھا۔ مجھے وہاں ایک سال ہو گیا تھا۔ ساری آبادی مجھے پہچانتی تھی۔ لڑکی کے باپ نے بھی مجھے پہچان لیا۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا ـــــ "ملک صاحب! یہ میری ایک ہی بیٹی ہے اور ایک بیٹا ہے۔ لڑکی اپنی ماں کی نشانی ہے۔ میں نے اُس کی پسند کے لڑکے کے ساتھ اُس کی شادی کی ہے۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا" ـــــ

اُس نے میری ٹھوڑی چھو لی۔ ساجد کا بھی صبر ٹوٹ گیا۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔

میں نے لڑکی کے باپ سے کہا ـــــ "اگر مجھے مکمل معلومات مل جائیں تو میں لڑکی کا سراغ جلدی لگا سکوں گا۔ مجھ سے کچھ چھپائیں نہیں"

میں نے ساجد کو باہر بھیج دیا اور باپ سے پوچھا ـــــ "کیا لڑکی خاوند سے خوش تھی؟"

"اُس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "یہ اس کی اپنی پسند کی شادی تھی۔ لڑکی کی ماں مر چکی

تھی۔ شادی اس کے بعد ہوئی تھی"

ساجد کی سوتیلی ماں کے سلوک کے متعلق پوچھا تو اُس نے اس عورت کی تعریفیں بالکل اُسی طرح کیں جس طرح ساجد اور اس کے باپ نے کی تھیں۔ یہ شخص وہاں جاتا رہتا تھا۔ کہتا تھا کہ ایسی اچھی اور رکھ رکھاؤ والی عورت اُس نے کم ہی کہیں دیکھی ہوگی۔ یہ سُن کر مجھے تفتیش کی ایک اور لائن اختیار کرنی پڑی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑکی نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ برادریوں والے ایسی شادی پسند نہیں کیا کرتے۔ جن کو رشتے سے جواب ملتا ہے وہ انتقامی کارروائیوں پر اُتر آتے ہیں جیسا کہ میں آپ کو پہلی کہانیوں میں بتا چکا ہوں، پولیس کے لیے کوئی بھی واقعہ یا حادثہ ناقابلِ یقین نہیں ہوتا۔ شہری عموماً کوئی اَن ہونی سی بات سُن کر کہا کرتے ہیں ـــــ "نہ جی۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ایسے تو ہو نہیں سکتا" ـــــ پولیس والے یوں نہیں کہا کرتے اور نہ کسی بات کو ناقابلِ یقین سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔

"لڑکی کا رشتہ کسی اور نے بھی مانگا تھا؟" ـــــ میں نے لڑکی کے باپ سے پوچھا۔

"تین گھرانوں نے رشتہ مانگا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "لڑکی کی پسند یہ لڑکا تھا۔ یہ ہماری برادری کا لڑکا نہیں۔ میں نے بھی لڑکے کو پسند کر لیا اور شادی کر دی"

"کیا لڑکی نے آپ کو مجبور کیا تھا کہ شادی ساجد کے ساتھ ہی کرائیں؟"

"نہیں!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "یہ میری لاڈلی بیٹی ہے۔ میں نے اس کی مرضی اور پسند کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اُس نے اپنی پسند بتائی اور میں نے پوری کر دی"

"جنہیں آپ نے جواب دیا تھا وہ ناراض ہوتے ہوں گے؟"

"ناراض تو ساری برادری ہوئی تھی" ـــــ اُس نے جواب

دیا ——— "مجھے فیصلہ بدلنے کو کہا گیا، لیکن میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس لڑکے اور اس گھر میں کوئی خرابی بتا دو جہاں میں رشتہ دے رہا ہوں۔"

"کسی نے شدید ناراضگی کا بھی اظہار کیا تھا؟" ——— میں نے پوچھا ——— "میرا مطلب یہ ہے کہ کسی نے آپ کو انتقام کی دھمکی دی تھی؟"

"ایک گھرانے سے مجھے صاف الفاظ میں انتقام کی دھمکی ملی تھی" ——— اُس نے جواب دیا ——— "وہ آخر دم تک رشتے کے لیے پیچھے پڑے رہے، بلکہ نکاح کے روز سے ایک دن پہلے بھی اُن کا پیغام ملا کہ اب بھی وقت ہے، سوچ لو۔ میں سوچ چکا تھا۔ مجھے گڑبڑ کا ڈر تھا لیکن شادی خیریت سے ہو گئی۔ اُس سے اگلے روز اُن کی طرف سے دھمکی ملی کہ ہم اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔ لڑکی کسی اور گھر میں نہیں بسے گی۔"

اُس نے بتایا کہ دھمکی دینے والے خاندان کے چار بیٹے ہیں۔ اُن کے پاس پیسہ بھی ہے اور اثر و رسوخ بھی اور وہ نیک نام لوگ بھی نہیں۔

میں نے اس پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک سال گزر گیا ہے۔ اگر یہ لوگ کوئی اوچھی حرکت کرنا چاہتے تو کر چکے ہوتے۔ میں نے لڑکی کے باپ سے اس پر تبادلۂ خیالات کیا تو اُس نے کہا کہ اُسے اس خاندان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ جس لڑکے کے لیے رشتہ مانگتے تھے اُس کی اُنہوں نے دو ہی مہینے بعد شادی کر دی تھی۔ مجھ سے انتقام صرف یہ لیا تھا کہ شادی پر مجھے نہیں بلایا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی کوئی بات نہ کی۔

لڑکی شوقین مزاج تھی

میں نے اس لڑکے کے باپ کا نام پتہ معلوم کر لیا۔ لڑکی کے باپ سے پوچھا کہ اُس کا بیٹا کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریلوے میں ملازم ہے۔ اُس کی بیوی گھر تھی۔ میں نے باپ کو باہر بھیج کر اُس کی بہو کو بلا لیا۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اُس سے کام کی کوئی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ اُس سے پوچھا کہ لڑکی سسرال میں خوش تھی یا نہیں۔ اُس نے بھی ساجد کی سوتیلی ماں کے سلوک کی تعریف کی۔ ساجد کی بھی تعریف کی اور کہا ——— "اُس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ اُس کا بہت پیار تھا"

میں نے پوچھا کہ وہ شکل و صورت کی کیسی تھی تو اُس نے بتایا کہ خوبصورت تھی۔ اُس کی طبیعت اور عادتوں کے متعلق اُس نے بتایا کہ لڑکی کا چلن اچھا تھا، البتہ شوقین مزاج تھی۔ اچھے سے اچھے کپڑے پہننے اور جمع کرنے کا اُسے خبط تھا۔ کوئی ایسی بھولی بھالی بھی نہیں تھی۔ تیز طرار تھی۔

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد اُس نے ایک اور محبت شروع کر دی ہو؟" ——— میں نے پوچھا ——— "تمہاری رائے میں اس لڑکی میں اتنی جرأت تھی کہ کسی اور کے ساتھ بھاگ جائے؟"

اُس نے سوچ کر جواب دیا ——— "میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اُس میں جرأت تھی لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اُس میں جرأت نہیں تھی۔ وہ شوقین مزاج ضرور تھی۔ سسرال میں وہ کسی اور راستے پر چل پڑی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں کہ اُسے کوئی اتنی آسانی سے خراب کر دے۔"

اُس کی رائے دو غلی قسم کی تھی۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر لڑکی پوری طرح پاک صاف ہوتی تو اُس کی بھابھی ذرا زور دے

کرہتی کہ وہ شریف لڑکی تھی۔ اُس نے ایسا بالکل نہیں کہا تھا۔ میرے
دماغ میں وہ عورت اٹک گئی تھی جس کے ہاتھ ساجد نے شادی سے
پہلے لڑکی کو محبت نامہ بھیجا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ابھی
یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ لڑکی کو زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔ اگر ساجد کی ماں
سچ کہتی تھی کہ وہ برقعہ لے کر صرف یہ بتا کر نکلی کہ سویٹر کا نمونہ لینے جا رہی
ہے اور یہ نہیں بتایا کہ نمونہ کس سے لینے جا رہی ہے تو یہ واردات
اغوا کی نہیں تھی۔ رشتے سے انکار پر لڑکی کے باپ کو انتقام کی
دھمکی دینے والا خاندان بھی میرے ذہن میں تھا لیکن اس پر میری توجہ
اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اُنہیں فوراً مشتبہ سمجھ لیتا۔ ایک سال تک غصہ
ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ انتقامی کارروائیاں گرما گرمی میں فوراً کر دی جاتی ہیں۔

میں نے ساجد کو یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ وہ شام پانچ بجے تھانے
میں آجائے۔ میں تھانے گیا اور ایک کانسٹیبل کو اس عورت کا نام پتہ
بتا کر تھانے میں لانے کو کہا۔ میں نے پچھلی دو کہانیوں میں اس نسل کی
عورتوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمان معاشرے کا لازمی کردار بنی ہوئی ہیں۔
ایسی عورتوں کی جوانی خاوندوں کو انگلیوں پر نچاتے اور آشنائیاں کرتے
گزرتی ہے۔ جوانی ڈھل جاتی ہے تو وہ چوری ترک کر کے ہیرا پھیری
شروع کر دیتی ہیں۔ آشنائیاں کراتی اور رابطے کا کام کرتی ہیں۔ رشتے
جوڑتی بھی ہیں توڑتی بھی ہیں۔ ہر قسم کی اداکاری کر سکتی ہیں۔ یہ عورت
بھی مجھے اسی نسل کی معلوم ہوتی تھی۔ میں قصبے کی ایسی دو عورتوں
کو جانتا تھا۔ دونوں میری مخبر تھیں۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا۔

وہ آگئی۔ تھانے میں پہلی بار آئی تھی۔ اُس کی گھبراہٹ قدرتی
تھی۔ میں نے اپنے مخصوص انداز سے اُس کی گھبراہٹ دُور کی اور
اُس کے دل سے یہ خوف اتارا کہ اُسے کسی جرم کی پاداش میں بلایا گیا
ہے۔ اُس نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں خاوند مر گئے تھے۔
پہلے خاوند سے دو لڑکے ہوئے تھے۔ ایک بچپن میں مر گیا اور دوسرا

پندرہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اُس وقت تک وہ دوسری
شادی کر چکی تھی۔ دوسری شادی سے ایک لڑکی تھی۔ پھر خاوند
مر گیا تو اُس نے تیسری شادی نہیں کی۔ لڑکی کو اُس نے سولہ سال
کی عمر میں بیاہ دیا تھا۔ اس کے بعد اُس کی زندگی تنہا گزری۔ اُس نے
کہا ——— "لڑکی کی شادی کر کے زندگی اللہ اللہ کرتے گزار
رہی ہوں۔ گھر گھر کی خدمت کرتی ہوں۔"

"تھوڑی سی خدمت میری بھی کر دو" ——— میں نے ایسے
لہجے میں کہا جس میں تھانیداری کا رعب نہیں تھا، نہ ہی طنز تھی۔ میں
نے کہا ——— "اس کی اُجرت دوں گا۔ اگر چاہو تو باقاعدہ تنخواہ
لگوا دوں گا۔"

"جھاڑو برتن کا کام ہے؟" ——— اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتا دیا کہ کیا کام ہے اور یہ کام کس طرح کیا جاتا
ہے۔ میں آپ کو اس کام کی تفصیل اس لیے نہیں بتا رہا کہ کہانی لمبی ہو
جائے گی جس میں یہ حصہ غیر ضروری ہوگا۔ دوسری وجہ نہ بتانے کی یہ ہے
کہ یہ پولیس کا ایک راز ہوتا ہے۔ اب بھی معاشرے کے اس قسم
کے کردار پولیس کے کام آتے ہیں۔ ان کی بدولت زمین میں اور گھروں
کی چار دیواری کے اندر چھپے ہوئے سراغ جنہیں ہوا بھی نہیں لگتی،
پولیس تک پہنچ جاتے اور اصل مجرم پکڑنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔
میں نے اس عورت کو مخبری کے لیے تیار کر لیا اور اُسے اجرت بھی بتا
دی۔ اُسے تیار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ یہ کام اس کی
فطرت کے عین مطابق تھا۔ اُس کے دل سے تھانے اور پولیس کا
خوف نکل گیا۔ تب میں نے اُس سے پوچھنا شروع کیا کہ ساجد کی
بیوی کے متعلق کیا کچھ جانتی ہے۔ میں نے اپنے انداز سے سوال کیے۔

پہلا سوال یہ تھا ——— "شادی سے پہلے تم ساجد کا رقعہ
اس لڑکی تک لے گئی تھیں؟"

اُس نے انکار نہیں کیا۔

"وہ لڑکی اب کہاں ہے؟" ——— میں نے پُوچھا۔

"اپنے گھر ہوگی" ——— اُس نے کہا اور پوچھا ——— "کیوں؟ کیا بات ہے؟"

اُسے لڑکی کی گمشدگی کا علم نہیں تھا۔

"تم میرے سوالوں کا جواب دیتی جاؤ" ——— میں نے کہا ——— "پھر بتاؤں گا کہ بات کیا ہے۔"

"ساجد کے علاوہ بھی کسی نے کبھی اس لڑکی پر نظر رکھی تھی؟"

"آپ اس لڑکی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں کہ کیسی ہے؟" ——— اُس نے پُوچھا۔

میں نے چونکہ اُس کے ساتھ دوستانہ بے تکلّفی پیدا کر لی تھی، اس لیے اُس نے اسی بے تکلّفی سے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور مُسکرا کر بولی ——— "دل میں اُتر گئی ہے؟ کہاں دیکھی تھی؟"

"تم بتاؤ وہ کیسی ہے؟" ——— میں نے کہا ——— "اس کے متعلق جو کچھ جانتی ہو بتا دو۔"

لڑکی ایک امیرزادے کے کمرے میں

اُس نے جواب دیا کہ یہ لڑکی بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو سولہ سال کی لگتی تھی۔ امیرزادوں نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ کسی نے رشتے کے لیے کسی نے دوستی کے لیے۔ چودہ سال کی عمر میں اسے پردے میں بٹھا دیا گیا۔ لڑکی شوخ تھی۔ سہیلیوں کے گھروں میں اس کا آنا جانا تھا۔ بعض اوقات بُرقعے کا نقاب اٹھا دیتی تھی۔ بیس سال کی عمر کے بعد چار لڑکوں نے یکے بعد دیگرے اس عورت کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے لڑکی تک پیغام پہنچائے۔ ایسے پیغام پہنچانے کا

ایک خاص ڈھنگ ہوتا ہے۔ عورت پہلے اداکاری سے لڑکی کے دل پر قبضہ کرتی ہے۔ اس میں کئی دن لگتے ہیں۔ چرب زبانی اور اداکاری کے دیگر کمال دکھانے پڑتے ہیں پھر موقع محل موزوں دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔

اس عورت نے لڑکی کو قبضے میں لے لیا مگر اُس نے کسی کی بھی دوستی قبول نہیں کی۔ اس عورت کو دھتکارا بھی نہیں۔ گھر میں کوئی پرانی عمر کی عورت نہیں تھی۔ لڑکی کی ماں مر چکی تھی۔ اس کے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو دلہن بھی اس عورت کو پسند کرنے لگی۔ اس طرح اس عورت کے لیے اس گھر میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔

اُس نے ایک شادی شدہ امیرزادے کا نام لیا۔ یہ اُس مسلمان خاندان کا فرد تھا جس کے باپ دادا نے انگریزوں کی بہت خدمت کی اور انعام واکرام پایا تھا۔ انگریزوں نے انہیں جاگیر بھی دی تھی اور پنشن بھی۔ اُس کی نظر اس لڑکی پر پڑ گئی۔ اُس نے اس عورت کے ساتھ بات کی اور منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ یہ آدمی امیر بھی تھا، خوبرو بھی۔ عورت لڑکی کی یہ کمزوری جانتی تھی کہ وہ کپڑوں کی شیدائی ہے۔ وہ اس آدمی کی طرف سے لڑکی کے لیے ریشمی کپڑوں کا ایک جوڑا لے گئی۔ اُس نے لڑکی پر ایسا طلسم طاری کر دیا کہ ایک دن لڑکی اس امیرزادے کے خاص کمرے میں چلی گئی۔

اس عورت کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بند کمرے میں کیا ہُوا۔ اس کے بعد لڑکی اس کے پاس ایک دفعہ اور گئی پھر اس نے جانا چھوڑ دیا۔ اس عورت نے امیرزادے سے خوب پیسے بٹورے۔ ساجد کی بہن اس لڑکی کے پڑوس میں بیاہی ہوئی تھی۔ لڑکی اس کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہاں اُس نے ساجد کو دیکھا تو اُسے پسند آگیا۔ لڑکی نے اس عورت سے کہا کہ وہ ساجد کے ساتھ بات کرے۔ اُس نے اس عورت کو پیسے دیئے۔

عورت نے ساجد کو صرف یہ بتایا کہ فلاں لڑکی اُسے چاہتی ہے۔ مرد کو پھانسنا کوئی مشکل نہیں۔ ساجد نے اپنی بہن کے گھر اس لڑکی کے ساتھ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ساجد نے دو دفعہ اس عورت کے ہاتھ رقعہ بھیجا۔ اس میں سے ایک سنبھال کے رکھا ہُوا تھا جو میں نے اس کے ٹرنک میں دیکھا تھا۔ اس دوران امیرزادہ اس عورت کے پیچھے پڑا رہا کہ لڑکی کو ایک بار پھر لاؤ لیکن وہ نہ گئی۔ وہ اب دل و جان سے ساجد کی ہو چکی تھی۔

پھر اُن کی شادی ہو گئی۔ پھر بھی امیرزادہ اس عورت کی معرفت لڑکی کو بُلاتا رہا۔ اُس نے کپڑوں کا ایک اور قیمتی جوڑا بھیجا۔ لڑکی پھر بھی نہ گئی۔ اُس نے کپڑے رکھ لیے تھے۔ امیرزادے نے عورت کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ تمہیں اغوا کرا دوں، تمہارا کسی کو نشان بھی نہیں ملے گا۔ لڑکی اس کے گھر چلی گئی۔ عورت کو معلوم نہیں کہ کب تک اُس کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد وہ آدمی پھر اُسے بلاتا رہا لیکن لڑکی نہیں گئی۔

"اُسے اس آدمی کے پاس گئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"پانچ چھ مہینے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "وہ اب بھی اُسے بلاتا ہے۔"

"تم نے لڑکی کو کب دیکھا تھا؟"

"کوئی دس روز ہوئے" ——— اُس نے کہا ——— "اب وہ آدمی بہت غصّے میں ہے۔ کہتا ہے کہ فریبی لڑکی ہے۔ اتنے قیمتی کپڑے ہضم کر گئی ہے۔ میں ایک ایک پیسہ وصول کر لوں گا۔"

"اس آدمی کے کسی اور عورت کے ساتھ بھی تعلقات ہیں؟"

"تین کو تو میں جانتی ہوں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اور بھی ہوں گی۔ اُس کی بیوی اللہ کی گائے ہے اور آدمی رنگین مزاج۔"

یہ عورت جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ میرا دماغ کہیں اور چلا گیا۔ اس

آدمی میں یہ ہمّت تھی کہ وہ لڑکی کو بلا کر غائب کر سکتا تھا، مگر اس عورت کو تو معلوم نہیں تھا کہ لڑکی لاپتہ ہو چکی ہے۔ کیا یہ عورت جھوٹ بول رہی تھی؟ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اب لڑکی کے پاس جاتی ہے یا نہیں؟

"وہ اب نہیں مانے گی" ——— اُس نے جواب دیا ——— "مَیں اُس سے تنگ آ چکی ہوں۔ اب وہ خاوند کو دھوکہ نہیں دے گی۔"

"ساجد کی سوتیلی ماں کیسی ہے؟"

"ہوشیار عورت ہے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "وہ کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں۔"

"ساجد کے ساتھ اُس کا برتاؤ کیسا ہے؟"

"مجھے کچھ شک ہے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں نے دو دفعہ اُنہیں اس حالت میں دیکھا ہے کہ ساجد لیٹا ہُوا تھا اور سوتیلی ماں اُس کا سر دبا رہی تھی۔"

میرا دماغ اس امیرزادے کے گرد گھوم رہا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا لڑکی کو اُس نے اغوا کیا ہے یا اُسے معلوم ہی نہیں کہ لڑکی لاپتہ ہے۔ مجھے اب یہ شک ہونے لگا تھا کہ لڑکی کو اُس نے بُلایا، وہ گئی اور اُس نے اُسے غائب کر دیا۔ میرے پاس ایسا کوئی جواز نہیں تھا کہ اُس کے گھر چھاپہ مارتا۔ بہت دیر سوچ سوچ کر میں نے اس عورت سے کہا کہ وہ اس آدمی سے کہے کہ لڑکی اُسے ملنا چاہتی ہے، لیکن اُس کے گھر میں نہیں ملے گی۔ کوئی اور جگہ مقرر کرو۔ عورت ڈر گئی۔ کہنے لگی ——— "آپ اُس جگہ پہنچ کر اُسے پکڑ لیں گے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میں اُسے نہیں پکڑوں گا" ——— میں نے اُسے کہا ——— "اُس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم

اس آدمی کو یہ جھانسہ دے کر کسی خاص جگہ لے جاؤ اور میں دیکھ لوں کہ تم اسے لے آئی ہو تو تمہاری سفارش کر کے تنخواہ اچھی مقرر کرا دوں گا۔ مجھے اپنی استادی دکھاؤ۔"

"آپ نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس لڑکی کے متعلق، اس کے خاوند اور خاوند کی سوتیلی ماں کے متعلق آپ نے اتنی باتیں کیوں پوچھی ہیں؟"

"صرف امتحان لینے کے لیے" ــــــ میں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کہا ــــــ "تم جانتی ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھے کسی نے کہا تھا کہ تم اُلٹے سیدھے کاموں میں ذلیل و خوار ہوتی پھرتی ہو، تمہیں کہیں پکی نوکری دلا دوں۔ میرے پاس یہی کام ہے جو تمہیں بتا دیا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں لوگوں کے گھروں کی کتنی کچھ خبر ہے۔ تم نے اس امیرزادے کا نام لیا تو میں نے سوچا کہ اسی سے تمہارا امتحان لے لوں" ــــــ میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس آدمی کو وہ کیا کہہ کر لائے۔

آخر یہ طے ہُوا کہ وہ اُسے اگلی رات نو بجے اپنے گھر میں بُلائے گی میں نے اُسے بتایا کہ میں نو بجے سے پہلے اُس کے گھر میں آ کر چھُپ جاؤں گا۔ ہم نے سارا ڈرامہ طے کر لیا۔ اُس کی منت سماجت پر میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اس آدمی کو پکڑوں گا نہیں۔ وہ بڑی خوش ہو کے چلی گئی۔

سوتیلی ماں، سوتیلا بیٹا
ــ دونوں جوان تھے

شام پانچ بجے ساجد آگیا۔ اُس سے میں نے اُن کی ازدواجی زندگی

کے متعلق بہت سے سوال پُوچھے۔ پھر میں نے توجہ اُس کی سوتیلی ماں پر مرکوز کر دی۔ وہ اُس کی تعریفیں کرنے لگا۔

"وہ جب تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارا سر دباتی اور تمہارے سینے پر ہاتھ پھیرتی تھی، کیا اُس وقت تمہاری بیوی موجود ہوتی تھی؟"

وہ اس طرح چونکا جیسے بدک گیا ہو۔ جواب دینے کی بجائے وہ مجھے پھٹی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس کا یہی ردّعمل میرے لیے کافی تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ لڑکی ان دونوں کے نازیبا تعلّقات یا بے جا تکلّفی کی وجہ سے اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ اُس کا یہ اقدام انتقامی بھی ہو سکتا تھا۔ میرے سامنے اب یہ امیرزادہ آگیا تھا۔ اُس نے لڑکی کے لیے زمین ہموار کر رکھی تھی اور وہاں لڑکی کے لیے کشش بھی تھی۔ اس لائن پر سوچتے ہوئے میں نے ساجد کو جرح کے جال میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔

میں نے تقریباً دو گھنٹے صرف کیے۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس انسپکٹر کسی کے دل سے بات نکلوانے کے لیے سیدھی یعنی ڈائریکٹ بات نہیں کرتے۔ بڑی دُور کا چکّر کاٹنا پڑتا ہے۔ میں ساجد پر یہ تاثر پیدا کرنے لگا کہ اگر سوتیلی ماں کے ساتھ اُس کا پیار ہے تو یہ کوئی جرم نہیں اور نہ ہی مجھے ایسے پیار پر کوئی اعتراض ہے۔

دوستانہ رنگ میں، گپ شپ کے انداز سے، اُس کی سوتیلی ماں کو بہت اچھی عورت سمجھ کر میں ساجد کو اس مقام پر لے آیا جہاں اُس نے کچھ باتیں بتا دیں۔ اُس نے مُسکرا کر مجھ سے پوچھا ــــــ "آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ وہ میرا سر دبایا کرتی ہے اور میرے سینے پر ہاتھ بھی پھیرا کرتی ہے؟"

"مجھے اس سے بھی زیادہ باتیں معلوم ہیں" ــــــ میں نے اُسے کہا ــــــ "جن باتوں کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ تمہارے اور تمہاری سوتیلی ماں کے سوا کسی کو معلوم نہیں، میں تمہیں وہ باتیں

بھی بتا سکتا ہوں۔ دن اور وقت بھی بتا سکتا ہوں۔"

"آپ مجھے اس جرم کی سزا دیں گے؟"

"بالکل نہیں" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ "گھروں میں لگ جو جی میں آئے کریں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہاری بیوی گھر سے کیوں گئی ہے اور کیا یہ کسی کی شرارت تو نہیں؟ تم اگر ساری باتیں خواہ وہ کتنی ہی بے معنی اور چھوٹی چھوٹی کیوں نہ ہوں مجھے بتا دو تو میں ان کی روشنی میں آگے بڑھوں اور تمہاری بیوی واپس لاؤں۔"

اُس نے کچھ اپنے آپ اور کچھ میرے سوالوں کے ذریعے جو انکشاف کیے وہ یہ ہیں کہ اس کی سوتیلی ماں اُس کے ساتھ صرف اچھا سلوک ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اُسے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کوشش کو بھی ساجد ماں کا پیار سمجھتا رہا۔ مثلاً ساجد کام سے آکر لیٹ جاتا تو سوتیلی ماں اُس کا سر دبانے لگتی اور کبھی کبھی اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر سینے پر پھیرنے لگتی۔ تیسرے چوتھے روز وہ یہ حرکت ضرور کرتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ ساجد کے باپ کی خدمت ایسے والہانہ طریقے سے کرتی تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے اور جب ساجد کی شادی ہوگئی تو سوتیلی ماں نے دلہن کو بھی اپنی بیٹی بنا لیا۔ اُسے کوئی کام نہ کرنے دیتی اور اتنا پیار کرتی کہ لڑکی اس کی زرخرید غلام ہوگئی۔ وہ سہیلیاں بن گئیں۔ دُلہن کی عمر تئیس چوبیس سال اور سوتیلی ماں کی تیس سال کے لگ بھگ تھی۔

میں چونکہ ساتھ ساتھ سوال کرتا جا رہا تھا، اس لیے میرے مطلب کی باتیں سامنے آرہی تھیں۔ انہی سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ سوتیلی ماں اکثر ساجد کی بیوی سے کہا کرتی تھی کہ اپنے آپ کو اس گھر میں پابند نہ سمجھو، جاؤ ابّا جان سے مل آؤ، اور وہ ساجد کے باپ سے کہا کرتی کہ آپ اسے لے جائیں، بے چاری ماں کی نشانی

ہے، اس کے ابّا جان یہ نہ سمجھیں کہ بچی سُسرال میں قید ہوگئی ہے۔

ساجد کا باپ اُس کی بیوی کو لے کے چلا جاتا تو سوتیلی ماں ساجد پر توجہ مرکوز کر دیتی۔ اُسے پراٹھے کھلاتی۔ اُسے پاس بٹھاتی اور اس کے ساتھ بے تکلف دوستوں کی طرح کھیلنے کی کوشش کرتی۔ تین چار بار ایسے ہُوا کہ ساجد کی بیوی کی موجودگی میں جب وہ غسل خانے میں یا کسی کام سے کوٹھے پر تھی، سوتیلی ماں نے بے تابی سے ساجد کو بازوؤں میں لے لیا اور ساجد کی بیوی نے دیکھ لیا۔ اس لڑکی کے چہرے پر ساجد نے ناراضگی کے صاف تاثرات دیکھے، لیکن اُس نے شکایت ایک بار بھی نہیں کی۔

ساجد جھجک گیا اور کچھ باتیں ہضم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ سے وہ بھلا کیا چھپا سکتا تھا۔ میں نے اُس کا سینہ کھول دیا تھا۔ اسے اب وہ بند نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس ڈھنگ سے سوال کر کے اُس سے اگلوا لیا کہ اُس کی سوتیلی ماں نے چند مہینوں کی بے تکلفی کے بعد اُس پر ظاہر کر دیا کہ اُن کا رشتہ ماں بیٹے والا نہیں۔ اُس نے یہ اظہار حرکتوں سے بھی کیا اور باتوں سے بھی، مگر ساجد ایک خاص حد تک اُس کا ساتھ دیتا رہا، اس سے آگے نہ بڑھا۔ اُس نے اس جوان عورت کو ٹھکرایا نہیں، لیکن اس کی خواہش بھی پوری نہیں کی۔ ساجد ہاں اور نہ کے درمیان لٹکا رہا۔ اُسے سوتیلی ماں کا پیار اچھا لگتا تھا۔ اس حد تک وہ سوتیلی ماں کا دوست یا آشنا بنا رہا۔ وہ اپنے باپ اور اپنی بیوی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا حالانکہ وہ دونوں کو دھوکہ دے رہا تھا۔ اُس نے ماں بیٹے کے رشتے کو دوستی میں بدل دیا تھا۔ سوتیلی ماں نے ساجد کی بیوی اور اس کے باپ کے ساتھ سلوک میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ اُن کے ساتھ پیار میں فرق نہ آنے دیا۔

ساجد نے یہ بھی بتا دیا کہ گزشتہ ایک مہینے سے اس کی بیوی اور سوتیلی ماں میں پہلے والی بے تکلفی نہیں رہی۔ ان میں کھچاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ سوتیلی ماں اس کھچاؤ کو ختم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اب بھی

لڑکی سے کہتی تھی کہ ابّا جان کو دیکھ آؤ لیکن لڑکی نہیں جاتی تھی ....
گمشدگی سے چند دن پہلے وہ کچھ خاموش خاموش رہنے لگی تھی۔ بیٹا
پریشان رہنے لگا۔ اُس نے سوتیلی ماں سے کہا کہ اب وہ اُس سے دُور
رہے گا کیونکہ اس کی بیوی ناراض ہوتی ہے۔

بوڑھے باپ کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔
وہ اسی میں مست تھا کہ اُس کی جوان بیوی نے اُس کے بڑھاپے
کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے۔ ذرا تصور فرمائیے کہ ایک بوڑھے
نے محض ہوس کاری کے لیے شادی کی اور کتنے بڑے حادثے کا
باعث بنا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی ازدواجی زندگی تباہ کر دی۔
قانون میں ایسے بوڑھوں کے لیے کوئی سزا مقرر نہیں۔ اُن کے
جرم کی سزا جوان لڑکیوں کو ملتی ہے۔ میں نے اس بوڑھے سے
بات کرنا یا اس مرحلے میں اسے تفتیش میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا
کیونکہ وہ میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔

ساجد کو میں نے رات نو بجے چھوڑا۔ ابتدائی کاغذی کارروائی مکمل
کی اور اپنے اس شک پر غور کرنے لگا کہ لڑکی انتقاماً چلی گئی ہے
اور اس کا ٹھکانہ اُس امیرزادے کا گھر ہے۔ گھر سے مُراد وہ گھر نہیں
جہاں وہ رہتا تھا بلکہ وہ جگہ جہاں اُس نے لڑکی کو چھپایا تھا۔ یہ تو ہو ہی
نہیں سکتا تھا کہ میں اُسے تھانے بلاتا اور کہتا کہ لڑکی دے دو ورنہ
حوالات میں بند کر دوں گا اور وہ لڑکی دے دیتا۔ اُس کے گھر چھاپہ
مارنے کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ لاپتہ لڑکی کے لواحقین سے بار بار پوچھنے
کے باوجود کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس امیرزادے کو پکڑنے اور
پرکھنے کا جو طریقہ میں نے سوچا تھا وہ کچھ مخدوش سا تھا۔ کبھی تو خیال
آتا کہ میں حماقت کر رہا ہوں اور کبھی یہ کہ یہی بہتر طریقہ ہے۔

دراصل یہ طریقہ تفتیش کی اُس ڈگر سے ہٹا ہوا تھا جو ہمیں
ٹریننگ میں سکھایا گیا تھا۔ میں تفتیش کے جنون میں مبتلا تھا۔ اسی

جنون کے زیرِ اثر نئی مخبر عورت کو میں نے کچھ ہدایات دی تھیں اور یہ
بھی کہا تھا کہ اب تم پولیس کے جال میں آ گئی ہو۔ پولیس کی مدد کرو گی
تو انعام پاؤ گی اور دھوکہ دو گی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ وہ شاید نہیں سمجھ
سکی تھی کہ اس امیرزادے کو اس کے ہاتھوں کسی تفتیش کے سلسلے
میں بلا رہا ہوں۔ وہ اسے امتحان سمجھ رہی تھی، تاہم میں اس امکان
سے بے خبر نہ رہا کہ یہ عورت لڑکی کے اغوا میں شریک ہو سکتی ہے
اور وہ میری تفتیش کو دشوار بنانے کی پوزیشن میں ہے۔

میں، عورت اور پلنگ

دوسرے دن میں دو اور کیسوں میں مصروف ہو گیا۔ میرا
اے۔ ایس۔ آئی عثمان علی پٹھان تھا جس کا ذکر میں شاید پہلے بھی
کسی کہانی میں کر چکا ہوں۔ وہ دلیر اور رنگین مزاج جوان تھا۔ عورتوں کے
کیسوں میں بہت دلچسپی لیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے اس کیس کی تفصیلات
بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ میں آج رات آٹھ بجے کے بعد فلاں جگہ، فلاں عورت
کے گھر جو فلاں علاقے میں ہے، ہوں گا اور میری سکیم کیا ہے۔

عثمان اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے چار کانسٹیبلوں
کو پرائیویٹ کپڑوں میں تیار کر لیا۔ دن کے وقت جا کر وہ علاقہ اور گھر
بھی دیکھ آیا اور اس علاقے کے چوکیدار کو بھی خبردار کر آیا۔ چوکیدار نیپالی
گورکھا تھا۔ گورکھے دیانتدار اور ڈیوٹی کے پکّے ہوتے تھے۔ رات کو اُسے
ان چار کانسٹیبلوں کے ساتھ اس علاقے میں، اس گھر کے اردگرد رہنا
تھا تاکہ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں یا ایک سے زیادہ افراد کو وہاں
گرفتار کرنا پڑے تو وِسل کی آواز پر پہنچ جائیں۔ میں بھی عورت کا گھر
دیکھ آیا۔

رات آٹھ بجے میں دھوتی، لمبے کُرتے اور ڈھیلی ڈھالی پگڑی
میں عورت کے گھر میں داخل ہُوا۔ میری دھوتی میں ریوالور تھا۔ عثمان
کانسٹیبلوں کے ساتھ علاقے میں پہنچ گیا۔ عورت کا گھر صاف سُتھرا تھا۔
دو کمرے تھے۔ کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے میں
دروازے کے ساتھ پلنگ تھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے چھُپنے کا فیصلہ
کیا۔ عورت نے پلنگ کے نیچے ٹرنک رکھ دیئے۔ پلنگ پوش نیچے
کر دیا۔ امیرزادے کو دُوسرے کمرے میں بیٹھنا تھا۔

عورت نے پہلی خبر یہ سُنائی کہ وہ شخص آ رہا ہے۔ دن کے وقت
عورت نے اُس کے گھر جا کر اُسے بتایا تھا کہ لڑکی اُسے ملنا چاہتی ہے
لیکن اُس کے گھر میں نہیں۔ اس مسئلے کو عورت نے یوں حل کیا کہ اپنا
گھر پیش کیا اور یقین دلایا کہ کسی کو علم نہیں ہوگا۔ وہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔
موسم سردیوں کا تھا۔ آبادی کی افراط آج والی نہیں تھی۔ شام کو ہی بازار
بند ہو جاتا اور آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سارا قصبہ گہری نیند سو جاتا تھا۔
میں جب عورت کے محلّے میں داخل ہُوا تو وہاں سنّاٹا طاری تھا۔

نو بجے سے ذرا پہلے میں پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ زیادہ انتظار نہ
کرنا پڑا۔ دوسرے کمرے میں مجھے کسی کے آنے کی آواز سنائی دی اور
یہ آواز آئی ـــــ "وہ ٹال نہ جائے" ـــــ عورت نے کہا ـــــ
"اُس نے بڑا پکّا وعدہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے ٹالے گی نہیں" ـــــ
اُس آدمی نے کہا ـــــ "دل میں آتی ہے کہ آج آئے تو اُسے گھر نہ جانے
دوں" ـــــ عورت نے کہا ـــــ "ہمّت کرو۔ شادی کرنا
چاہو تو میں اُسے طلاق کے لیے تیار کر لوں گی" ـــــ اس آدمی نے
کہا ـــــ "شادی ایک ہی کافی ہے۔ ایسی ڈائن پلّے پڑی ہے
کہ مرتی ہے نہ جان چھوڑتی ہے ... تم باہر چلی جاؤ۔ دیکھو وہ آ رہی ہوگی"۔
عورت چلی گئی۔ یہ آدمی فلمی گیت گنگنانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عورت اندر آئی۔ آدمی کی آواز سنائی دی ـــــ

"نہیں آئی؟ ..... وہ نہیں آئے گی۔ تم اُسے گھر سے لا سکتی ہو؟"
"نہیں" ـــــ عورت نے کہا ـــــ "وہ اس وقت کس
بہانے سے جاؤں؟"

لڑکی کو کہاں سے آنا تھا۔ وہ نہ آئی۔ امیرزادہ غصّے میں آ گیا۔
اس عورت کو اور لڑکی کو گالیاں دینے لگا۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ اسے
معلوم نہیں کہ لڑکی لاپتہ ہو چکی ہے۔ مجھے مایوسی ہوئی کہ لڑکی اس کے
پاس بھی نہیں۔ مجھے ایک گھنٹہ پلنگ کے نیچے گزارنا پڑا۔

خدا خدا کر کے وہ ٹلا۔ جاتے جاتے کہہ گیا ـــــ "اُسے کہنا
کہ کل رات میرے گھر نہ پہنچی تو میں اُسے گھر سے اٹھوا دوں گا"۔

دس منٹ بعد عورت باہر سے آئی۔ اندر سے دروازے کی
زنجیر چڑھائی اور میرے کمرے میں آ کر کہا ـــــ "نکل آؤ۔ اُسے
دُور چھوڑ آئی ہوں"۔

میں باہر نکلا تو اُس نے کہا ـــــ "مانتے ہو؟"

میں نے پوچھا ـــــ "تم لڑکی کے گھر گئی تھیں؟"

اُس نے جواب دیا ـــــ "آپ ہی نے کہا تھا کہ لڑکی کے گھر
نہ جانا۔ صرف اس آدمی کو یہ جھانسہ دے کر اپنے گھر بُلانا کہ لڑکی اسے ملنا
چاہتی ہے۔ اب بتاؤ، میں امتحان میں پاس ہوں؟ نکالو، کیا دیتے ہو؟"

میں نے کہا ـــــ "تم پاس ہو۔ کل تھانے آ جانا"۔

"آ جاؤں گی ...." اُس نے کہا ـــــ "کوئی اور خدمت بتاؤ۔
کہو تو لڑکی کو تمہارے پاس لے آؤں یا کسی اور پر ہاتھ رکھو"۔

مجھے ایک مایوسی تو یہ ہوئی کہ جس پر شک پختہ تھا وہ بالکل صاف
نکلا۔ اگر لڑکی اُس کے پاس ہوتی تو وہ آتا ہی نہ۔ دُوسرا دُکھ یہ ہُوا کہ
دلّالی کا کام صرف مسلمان عورتوں کی قسمت میں لکھا تھا۔ میرے پاس
جو دوسری دو مخبر عورتیں تھیں وہ بھی مسلمان تھیں۔

اُس دَور کو چھوڑیئے، پاکستان میں دیکھ لیجیے۔ مجبور عورت کا

کوئی ہمدرد نہیں ہوتا۔ سب اُس کی عصمت کے خریدار ہوتے ہیں شاید ہی کوئی سوچتا ہو کہ اس بےکس اور مجبور عورت کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ لے اور اس کی عصمت کی حفاظت کرے۔ اس حقیقت سے صرف پولیس آگاہ ہے کہ ہم جن عورتوں کی غربت اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اُنہیں بدی کے راستے پر چلا دیتے ہیں وہ اُس عمر میں جا کر جہاں وہ کشش کھو بیٹھتی ہیں، خود ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو ورغلا کر بدی کے راستے پر چلاتی، اُن کی دلالی کرتی اور پیسے کماتی ہیں۔

یہ عورت ایسی ہی بدنصیبی کا شکار ہوئی اور اب جبکہ اُس کے سر کے کئی بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے کی رونق ختم ہو گئی تھی وہ پردہ دار لڑکیوں کو بدکار مردوں کے خفیہ کمروں میں داخل کرنے کا کاروبار کرتی اور سیدھی سادی بیویوں کے گھر اجاڑتی تھی۔ میں نے اُس کے امیرزادے گاہک کے چلے جانے کے بعد، اُس کے گھر بیٹھ کر اُسے سختی سے کہا کہ میں نے اُس کے لیے ذریعۂ معاش پیدا کر دیا ہے اور اب وہ دلّالی چھوڑ دے۔ میں نے اُس کا معقول ماہانہ مقرّر کرانے کا وعدہ کیا اور انعام کی صورت میں بھی تھوڑی سی رقم دلانے کا وعدہ کیا (جو بعد میں پورا بھی کر دیا تھا)۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے پاس مخبروں کی ایک فوج ہے۔ اگر اُس نے دلّالی کا کام کیا تو مجھے فوراً پتہ چل جائے گا۔ میں اُسے جیل خانے بھجوا دوں گا۔

وہ رو پڑی۔ کہنے لگی —— "پیٹ کی خاطر یہ جھک ماری تھی پھر یہ میری عادت بن گئی۔ آپ عزّت سے میرا پیٹ بھر دیں اور مجھے عزّت سے رہتا دیکھ لیں" —— اُس نے اپنی جوانی کی ایک واردات سُنائی جس نے اُسے ایک مجبوری کے عالم میں ایک مرد کے آگے ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سنبھل نہ سکی اور بدی کو ہی ذریعۂ معاش بنا لیا۔ اُس کی بیٹی جوان ہوئی تو اس کے امیر گاہکوں نے اس پر نظر رکھ لی۔ اس عورت نے اپنی بیٹی کی عصمت بچانے کے لیے دلّالی شروع

کر دی اور دوسروں کی بیٹیاں پھانسنے لگی۔ اس سے اُس نے جہیز بنایا اور کم عمری میں ہی بیٹی کو بیاہ دیا۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی عثمان اور اُس کے کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور تھانے چلا گیا۔ رات کو میں نے دماغ پر زور نہیں دیا۔ گھر جا کر سو گیا۔ دوسرے دن کاغذ سامنے رکھ کر پنسل سے تفتیش اور شکوک کا خاکہ بنانے لگا۔ اُس وقت تک حاصل کی ہوئی معلومات کو سامنے رکھ کر مشتبہ افراد کو نقطوں کی شکل میں کاغذ پر ایک ترتیب میں رکھا اور لکیریں ڈال کر نقطوں کو ملانے لگا۔ ذہن پر بے تحاشہ زور دے کر دیکھنے لگا کہ کون سا نقطہ کون سے نقطے کے ساتھ ملتا ہے۔

ہو سکتا ہے میرے بعض پولیس انسپکٹر بھائی یہ سوچیں کہ یہ نقطے کیا ہیں اور یہ خاکہ کیسا تھا اور تفتیش کا یہ کونسا طریقہ تھا؟ میں اُنہیں صرف یہ کہوں گا کہ تفتیش کا یہ طریقہ نہ ٹریننگ میں سکھایا جاتا ہے نہ کسی کتاب میں ملتا ہے۔ اگر توجہ اپنی ڈیوٹی پر ہو اور دل میں رشوت کا لالچ نہ ہو تو تھانیدار مجھ سے بھی زیادہ بہتر طریقہ تفتیش ایجاد کر سکتا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

شکاری اپنے ہی جال میں

میری تمام لکیریں سوتیلی ماں کے نقطے سے مل رہی تھیں۔ ساجد نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ماں بیٹے کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ ساجد کے کہنے کے مطابق ابھی اُن کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم نہیں ہُوا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس عورت کو ناپسند نہیں کرتا تھا، اُس کی تعریفوں کے پُل باندھتا تھا۔ ساجد کی بیوی کے متعلق پتہ چل چکا تھا کہ وہ اس قسم کی پردہ نشین لڑکی نہیں تھی جنہیں عورت مرد کی ہیرا پھیری کا علم ہی نہیں ہوتا اور جو پردے میں جوان ہو کر خاموشی سے

ڈولی میں بیٹھ جاتی ہیں اور اُس آدمی کو دل و جان سے قبول کر لیتی ہیں جسے انہوں نے پہلی بار دیکھا ہوتا ہے۔ وہ اپنے والدین کی پسند کو اپنی پسند بنا لیتی ہیں۔

وہ اس امیرزادے کے گھر جا چکی تھی، تحفے قبول کر چکی تھی اور اس دلال عورت کو رابطہ بنا کر ساجد سے محبت پروان چڑھا چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چالاک اور ہوشیار تھی اور وہ سوتیلی ماں کی نظروں کو سمجھتی تھی جن سے وہ اس کے خاوند کو دیکھتی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کے اشاروں کو بھی سمجھتی تھی۔ یہ اشارے وہ خود بھی کر چکی تھی اور اس پر کیے بھی گئے تھے۔ وہ یقیناً سمجھ گئی تھی کہ اُس کا خاوند اور اُس کی سوتیلی ماں کس راستے پر جا رہے ہیں۔ لڑکی چونکہ ہوشیار تھی اس لیے اس نے خاوند سے احتجاج نہ کیا۔ اُس نے خاوند سے بہتر ایک آدمی دیکھ لیا اور اُس کے ساتھ چلی گئی۔

سوتیلی ماں پر میرا شک اس لیے بھی پختہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے خاوند سے جو اچھا سلوک کرتی تھی، ساجد کے ساتھ جو پیار بھرا سلوک کرتی تھی اور ساجد کی بیوی کو جس طرح اس نے سہیلی بنا لیا تھا، وہ اس کی خوبی نہیں تھی۔ یہ بہت بڑا فراڈ تھا۔ اب میرے سامنے ایک تو ساجد کے باپ کا بڑھاپا اور سوتیلی ماں کی جوانی اور ساجد کی پرکشش جوانی تھی۔ سوتیلی ماں کا چہرہ اور جسم میرے سامنے آگیا۔ میں نے تصور میں اس پر غور کیا۔ اس کی مسکراتی آنکھیں اور ادھ کھلے ہونٹ، اُس کی گردن کا خم اور اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ عورت ایک دلکش حیوان ہے، شکاری ہے، تشنہ ہے۔ حیوانی تشنگی کی شدت انسان کو اندھا اور اُس کی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے، قتل!

میرے سامنے تین سوال تھے ——— کیا لڑکی کو سوتیلی ماں نے غائب کرایا ہے؟ کیا ساجد بھی اس جرم میں شامل ہے یا اسے علم ہی نہیں؟ اور کیا غائب کرا کے لڑکی کو قتل کر دیا گیا ہے؟

کیس بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ لڑکی کے قتل کی صورت میں قاتل کی تلاش ناممکن نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور تھی۔ قصبے کی ناکہ بندی کا وقت گزر گیا تھا، پھر بھی میں نے لاریوں کے اڈے اور ریلوے سٹیشن پر آدمی مقرر کر دیے۔ انہیں لڑکی کا قد بُت، سیاہ برقعے کی ساخت اور سینڈل بتا دیئے۔ شلوار سفید تھی۔ مجھے اب سوتیلی ماں کو تختۂ مشق بنانا تھا۔ اُسے میں نے تھانے بلا لیا۔ اُس کا خاوند اور ساجد بھی ساتھ آگئے۔

ساجد نے مجھے الگ کر کے کہا "آپ اسے یہ تو نہیں بتائیں گے کہ میں نے آپ کو ساری باتیں بتا دی ہیں؟" اُس نے منت سماجت کی کہ میں اُسے نہ بتاؤں۔

میں نے اُسے اور اُس کے باپ کو تسلی دلاسہ دے کر کہا کہ وہ بے فکر ہو کر گھر چلے جائیں، مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔ وہ گھبرائے گھبرائے سے چلے گئے۔ میں سوتیلی ماں کو تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ چارپائی پر بٹھا کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے کہا کہ ایک بار پھر بتاؤ کہ لڑکی کس وقت، کس طرح اور کیا کہہ کر گھر سے نکلی تھی۔

اُس نے سارا بیان دُہرا دیا جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ وہ شاید بھول گئی تھی کہ پہلے اُس نے کیا کہا تھا۔ جھوٹ کا یہی اثر ہوتا ہے کہ دوسری بار بولو تو پول کھل جاتا ہے۔ پہلے اُس نے کہا تھا کہ کھانا کھا کر گئی تھی۔ اب کہا کہ وہ جانے لگی تو میں نے اُسے کہا کہ کھانا کھا کے جانا تو اُس نے جواب دیا کہ واپس آکر کھاؤں گی۔

"وہ جب گھر سے نکلی ساجد کہاں تھا؟" ——— میں نے پوچھا۔

"برآمدے میں بیٹھا تھا۔"

"ساجد کا باپ کہاں تھا؟"

"کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔"

"اُسے معلوم تھا لڑکی باہر جا رہی ہے؟"

"اُسی کمرے سے برقعہ پہن کر نکلی تھی" ——— اُس نے جواب دیا ——— "ساجد کے باپ نے ضرور دیکھا ہو گا کہ وہ کہیں جا رہی ہے۔"

"ساجد نے اُس سے پوچھا ہو گا کہ کہاں جا رہی ہو؟"

"پوچھا تھا" ——— اُس نے جواب دیا ——— "لڑکی نے اُسے بھی یہی بتایا تھا کہ سویٹر کا نمونہ لینے جا رہی ہوں۔"

"تم سب کھانا اکٹھے کھاتے ہو؟"

"شام کا کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔"

"اُس شام بھی کھانا اکٹھے کھایا تھا؟"

"ہاں!"

"لڑکی نے بھی تم سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا؟"

"ہاں جی!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُسے ہم الگ تو نہیں بٹھاتے تھے۔"

"اس کے بعد وہ برقعہ پہن کر باہر چلی گئی تھی؟"

"جی ہاں!"

"ساجد بھی کھانے پر موجود تھا؟"

"بالکل موجود تھا۔"

"کھانے کے وقت وہ باہر سے آ گیا تھا؟"

"آ گیا تھا۔"

"اُس نے آتے ہی پوچھا ہو گا کہ اُس کی بیوی کہاں ہے" ——— میں نے کہا ——— "یا تھوڑی دیر بعد پوچھا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں کہ اُس نے کس وقت پوچھا تھا۔"

"تم نے اُسے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ کسی کے گھر سے سویٹر کا نمونہ لینے گئی ہے۔"

میں نے یہ چند ایک سوال اور اُن کے جواب بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔

آپ انہیں ایک بار پھر غور سے پڑھیں۔ آپ کو اس کے بیان میں واضح اختلاف نظر آئے گا۔ میں دو گھنٹے اس پر سوال پر سوال کرتا رہا۔ ایک ایک سوال کئی کئی بار گھما پھرا کر پوچھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ دوسرے گھنٹے کے دوران یوں سمجھئے کہ میں اُسے اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

مندرجہ بالا سوالوں اور جوابوں میں اُس نے یہ بھی کہا کہ لڑکی نے کہا تھا کہ کھانا واپس آ کر کھاؤں گی اور آگے چل کر یہ بھی کہا کہ اُس نے سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ساجد کے متعلق اُس نے کہا کہ وہ برآمدے میں بیٹھا تھا جب لڑکی باہر نکلی تھی اور اُس نے لڑکی سے پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہو۔ آگے چل کر اُس نے میرے ہیر پھیر میں اُلجھ کر کہا کہ ساجد باہر سے آیا تھا تو اُس نے بیوی کے متعلق پوچھا تھا، میں نے کہا تھا کہ کسی کے گھر سویٹر کا نمونہ لینے گئی ہے۔

اس عورت کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے ساجد کو شام پانچ بجے سے رات نو بجے تک جرح کا تختۂ مشق بنایا تھا اور اس سے بہت سی باتیں پوچھی اور اگلوائی تھیں۔ ساجد کے بیان کے مطابق، جب لڑکی باہر گئی اُس وقت وہ گھر نہیں تھا۔ اُس کے باپ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ لڑکی باہر نکل گئی ہے۔ سب نے کھانا اکٹھے نہیں کھایا تھا۔

"تم لڑکی کو اپنے خاوند کے ساتھ اُس کے گھر کیوں نہیں بھیج دیا کرتی تھیں؟" ——— میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس کا باپ اداس نہ ہو جائے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں لڑکی کو اپنے گھر میں قید نہیں رکھنا چاہتی تھی۔"

"تم نے اسے اور اپنے خاوند کو جتنی بار بھیجا ساجد گھر ہوتا تھا؟"

وہ گھبرائی۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ وہ بول نہ سکی۔ میں نے کہا ——— "تم ساجد کو اپنے ساتھ تنہا رکھنا چاہتی تھیں۔"

"وہ تو مجھے اپنی ماں سمجھتا ہے" ——— اُس نے کہا۔

"لیکن تم نے اُسے بیٹا سمجھنا چھوڑ دیا ہے" ——— میں نے

کہا اور ساجد نے اُس کی جو چند ایک حرکتیں بتائی تھیں، وہ اسے ساجد کا حوالہ دیتے بغیر سُنا دیں۔ میں نے کہا —— "ساجد کی بیوی نے تمہیں کئی بار دیکھ لیا تھا اور وہ روٹھی روٹھی رہنے لگی تھی۔"

"آپ کو یہ جھوٹی باتیں کون بتاتا رہا ہے؟" —— اُس نے کہا اور وہ رونے لگی۔

"ایک رات تم برآمدے میں سوتے ہوئے ساجد پر گر پڑی تھیں" —— میں نے کہا —— "ساجد گھبرا کر اٹھا تو تم نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُس کے کان میں کہا تھا کہ تمہارے ابا جاگ اٹھیں گے، میں اندھیرے میں چارپائی سے ٹھوکر کھا کر تمہارے اوپر گر پڑی ہوں۔ کیا جان بُوجھ کر اُس پر گری تھیں؟"

وہ اور زیادہ گھبرا گئی۔ اِدھر اُدھر بے چینی سے دیکھ کر بولی —— "گھپ اندھیرا تھا۔ پیشاب کے لیے اٹھی تو ساجد کی چارپائی راستے میں تھی۔ مجھے ٹھوکر لگی اور اُس پر گر پڑی۔"

"اُس رات ساجد کی بیوی اپنے گھر گئی تھی"

"جی!" —— اُس نے سسکی سی لی۔

"اگر تم گر پڑی تھیں" —— میں نے کہا —— "تو اُس کے پاس لیٹ کر تم اُس کے جسم پر ہاتھ کیوں پھیرنے لگی تھیں؟"

وہ اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ بے ہوش ہونے میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ میں نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار سے کہا —— "اپنی جوانی پر رحم کرو۔ ساجد اور اُس کی بیوی کے سہاگ پر رحم کرو اور بتا دو کہ لڑکی کہاں ہے۔ میں کیس یہیں ختم کر دوں گا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں اندر کے اور تمہارے سینے کے سارے بھید جانتا ہوں۔ اگر لڑکی کو میں نے برآمد کیا تو پھر معلوم نہیں کتنے سال جیل خانے میں گزارو گی۔"

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ لڑکی کو اسی نے غائب کرایا ہے۔ اس

کے جھوٹ میرے سامنے آچکے تھے۔

اُس کا سر ڈولنے لگا۔ وہ اب اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے اُس سے جو بھی بات کی، اُس نے جواب نہیں دیا، جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ میں نے اُسے حوالات میں بند کر دیا اور اپنے لیے یہ دشواری پیدا کر لی کہ اُس نے اقبالِ جرم نہ کیا تو شہادت اور ثبوت کہاں سے لاؤں گا۔ لڑکی کو اسی کی نشاندہی پر برآمد کیا جا سکتا تھا۔ لڑکی برآمد نہ ہونے کی صورت میں کیس ہی نہیں بنتا تھا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ کیا ساجد بھی اپنی بیوی کے اغوا میں ملوث تھا؟ غالب خیال یہ تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ اُس کی شخصیت میں اتنے سنگین جرم کی ہمت نظر نہیں آتی تھی۔

شام کے وقت ساجد، اُس کا باپ اور اس کا سُسر تھانے میں آئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ وہ میرے کمرے میں نہیں آیا۔ برآمدے میں بھی نہیں آیا۔ باہر ہی کھڑا رہا۔ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس پر توجہ نہ دی۔ ساجد اور دونوں بوڑھوں کو بتایا کہ اس عورت کی مجھے ابھی ضرورت ہے۔ اُن کے پوچھنے پر بھی میں نے نہیں بتایا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ انہیں تسلی دی کہ وہ میری تحویل میں ہے، پوری عزت سے اسے رکھا ہے۔ انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ رات کو گھر نہیں آسکے گی۔

ساجد اور اُس کا سُسر باہر نکل گئے۔ ساجد کا باپ مجھ پر جھکا اور التجا کی —— "آپ نے اُسے کیوں روکا ہوا ہے؟"

"آپ نے بڑے میاں، اس کے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟"

میرے دل میں اس بوڑھے کے خلاف اتنی نفرت اٹھی کہ میں نے اُسے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا —— "تمہاری یہ عمر شادی کی تھی؟ گھر میں جوان بیٹا، اور تم جوان بیوی لے آئے!" —— اُس کا منہ کھل گیا۔ میں نے اُسے کچھ اور کہنے کا موقع نہ دیا اور غصّے سے

کہا ——— "چلو نکلو یہاں سے۔"

لاش کس لڑکی کی تھی؟

رات دس بجے سے ذرا پہلے میں سوتیلی ماں کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ ہمارے درمیان سلاخوں والا دروازہ تھا۔ وہ فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے آواز دی تو وہ تیزی سے اٹھ کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں نے آہستہ سے کہا ——— "سوچ رہی ہو یا سوچ چکی ہو؟ اب بھی وقت ہے۔ لڑکی دے دو۔"

اُس نے ایک ہی سانس میں بہت سی قسمیں کھا کر جواب دیا ——— "وہ باہر چلی گئی تھی۔ میں تو گھر میں تھی۔ ساجد سے پوچھ لو۔ اُس کے ابّا سے پوچھ لو۔ میں اُسے کہاں سے نکال کر دوں۔"

مَیں نے اُسے اور کچھ نہ کہا۔ سنتری سے پُوچھا کہ اُسے کھانا دیا ہے یا نہیں۔ میں گھر چلا گیا۔

صبح کو میں بہت کچھ سوچ کر تھانے میں آیا۔ تفتیش کے چکر میں پڑنے سے پہلے عثمان کے ساتھ کچھ ضروری باتیں کیں۔ اللہ اُسے جنّت نصیب کرے۔ اس کیس کے سات آٹھ ماہ بعد ڈاکوؤں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ رنگین مزاج اور زندہ دل انسان تھا۔ کہنے لگا ——— "ملک ابّا! آپ زنانہ حوالات میں پٹاخے لا کر بند کر دیتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ خدا سے ڈرا کرو" ——— وہ مجھے ابّا جان یا ملک ابّا کہا کرتا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا ——— "اس عورت کو اگر تم نے غور سے دیکھا ہے تو اس چہرے میں تمہیں کیا نظر آیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا ——— "میں نے اُسے غور سے دیکھا ہے۔ آسمان میں پیوند لگا سکتی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا ——— "جرم کر سکتی ہے؟"

اُس نے جواب دیا ——— "آپ کو یہ پوچھنا چاہیئے تھا، کیا یہ عورت کوئی نیک کام کر سکتی ہے؟ اس کے چہرے پر گناہ کی دعوت لکھی ہوئی ہے۔"

میں نے عثمان کو چہرہ شناسی کی بہت ٹریننگ دی تھی۔ ہم اس عورت کے چہرے پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ قصبے سے تین میل دُور کے ایک گاؤں کا چوکیدار آیا۔ اُس نے اطلاع دی کہ قصبے اور گاؤں کے درمیان ویران علاقے میں ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ لڑکی شہری معلوم ہوتی ہے۔ لاش بالکل ٹھیک ہے۔ کسی درندے نے اسے نہیں چھیڑا۔

میں نے عثمان سے کہا ——— "یہ ہماری لاپتہ لڑکی ہے۔"

میں نے اپنا گھوڑا تیار کرایا۔ دو ٹٹو منگوا لیے۔ اس دوران چوکیدار نے بتایا کہ اُس نے لاش نہیں دیکھی۔ مُکھیا (نمبردار) نے اُسے کہا تھا کہ تھانے میں ایک لاش کی رپورٹ دے آئے۔ میں نے لڑکی کی لاش کو دیکھے بغیر ایک کانسٹیبل کو ساجد کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ لاش اُس کی لاپتہ بہن کی ہے۔ ایک کانسٹیبل کو اُسی کھوجی اور اُس کی ماں کو بُلانے کے لیے بھیج دیا جس کی ایک کہانی آپ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔

ساجد کے آتے ہی میں نے عثمان اور ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور روانہ ہو گیا۔ تین کانسٹیبلوں سے کہا کہ کھوجی آجائے تو وہ سب ہمارے پیچھے آئیں۔ میں نے ایک ٹٹو کھوجی کی ماں کے لیے پیچھے چھوڑ دیا۔

لاش قصبے سے دو میل دُور ایسے علاقے میں پڑی تھی جہاں سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ وہ کھڈ نالوں کا علاقہ تھا۔ جھاڑیاں اور درخت تھے۔ زمین بنجر تھی۔ پگڈنڈی دُور سے گزرتی تھی۔ قریبی گاؤں لاش کے مقام سے ایک میل دُور تھا۔ زمین کچی تھی جو کھُروں کے لیے نہایت

موزوں تھی۔ مکھیا نے یہ عقلمندی کی تھی کہ کسی کو لاش کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ گاؤں کے ایک آدمی کی بھینس بھاگ گئی تھی۔ وہ اس کی تلاش میں ادھر آنکلا تھا، ورنہ لاش کو درندے اور گدھ کھا جاتے اور اسے قابلِ شناخت نہ رہنے دیتے۔ میں نے لاش کو بالکل صحیح حالت میں دیکھا۔ پندرہ سولہ تماشائی اکٹھے ہو گئے تھے جو بہت دُور کھڑے تھے۔

ساجد لاش کو دیکھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی ہچکیاں نکلنے لگیں پھر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ لاش اُس کی بیوی کی تھی۔ لاش کے کپڑے بالکل ٹھیک تھے۔ اچھی طرح پہنے ہوتے تھے۔ کانوں میں سونے کے کانٹے، دو انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں اور ایک کلائی میں سونے کی دو چھوٹی چوڑیاں تھیں۔ چہرہ بالکل صاف تھا۔ لاش کی حالت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ مرنے سے پہلے اس کے ساتھ دست درازی نہیں ہوئی۔ سونے کے زیورات کی موجودگی بتاتی تھی کہ قاتل کا ارادہ لُوٹنے کا نہیں تھا۔ میں لاش کا جسم بے پردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دیکھنا بھی ضروری تھا۔ یہ ناخوشگوار کام مجھے کرنا تھا۔

میں نے تماشائیوں کے کندھوں سے چادریں اور کھیس اُتروا کر لاش کے ہر طرف تان دیئے۔ جن آدمیوں نے چادروں وغیرہ کو پکڑا تھا اُن کے منہ دوسری طرف پھیر دیئے۔ لاش کی قمیض ہٹا کر اور لاش کو کروٹ دے کر جس قدر جسم دیکھ سکتا تھا دیکھا۔ جسم پر خراش تک نہیں تھی۔ میں نے سارا جسم دیکھا۔ زیادتی یا تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گردن کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نشان نہیں تھا یعنی گلا دبا کر نہیں مارا گیا تھا۔ جسم پر زخم بھی کوئی نہ تھا۔ زہر ہی ہو سکتا تھا لیکن مجھے اس پر بھی شک تھا۔ لاش اکڑ گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے آدھی رات کے بعد مارا گیا تھا۔ اس حساب سے میں اسے نو دس گھنٹے بعد دیکھ رہا تھا۔ اگر زہر دیا گیا ہوتا تو جسم

کا رنگ بدل چکا ہوتا۔ لاش کی آنکھیں بھی بند تھیں، منہ بھی بند جیسے لڑکی سکون سے مری ہو۔ یہ تمام حالات میرے لیے معمّہ تھے۔ حیرت اس پر تھی کہ ایسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ قاتل نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ زیور تک کو نظرانداز کر دیا تھا۔

میں نے جن تماشائیوں سے چادریں اور کھیس لیے تھے، اس بہانے وہ آہستہ آہستہ قریب آ گئے۔ میں نے اُن کے سامنے کھوجی اور اُس کی ماں سے کہا کہ تم اپنا کام کرو۔ انہوں نے کھُرے دیکھنے شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے انہوں نے لاش کے سینڈل کے تلوے دیکھے۔ میں لاش کے ارد گرد زمین دیکھ چکا تھا۔ زمین کچی تھی ڈھول ہی ڈھول تھی۔ مجھے کہیں بھی ایسے نشان نظر نہ آئے جو یہ بتاتے کہ یہاں کوئی لڑا ہے یا کسی کو لٹایا یا بٹھایا یا گھسیٹا گیا ہے۔ لاش خاموش تھی، زمین خاموش تھی، درخت خاموش تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال کر میرا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔

کھوجی نے زمین سے بھید لینا شروع کر دیا۔ اُس کی بوڑھی ماں حیران کن حد تک ماہر کھوجی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ پرے چلی گئی۔ غیر ارادی طور پر میری نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ دُور جا کر وہ دوڑ پڑا۔ تفتیش ایسا فن ہے جس میں ذرا ذرا سی باتوں کو غور سے نہ سُنو اور معمولی سی اشیاء کو بیکار سمجھ کر نظرانداز کر دو تو تفتیش ناکام ہو جاتی ہے۔ موقعۂ واردات کا ایک ایک کنکر اور مٹی کا ذرّہ ذرّہ بولتا ہے۔ سننے کے لیے کان نہیں آنکھیں اور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر موقعۂ واردات پر جا کر نظر متعلقہ گاؤں کی مرغیوں اور مکھن پر رکھ لو تو سامنے آتے ہوئے سراغ اور نشانیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

میں نے اس آدمی کو تماشائیوں میں سے نکل کر تیزی سے گاؤں کی طرف جاتا دیکھا تو میری فالتو حِس بیدار ہوگئی۔ یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا لیکن میں نے وہم کے تعاقب میں چوکیدار کو بھیج دیا۔ اسے میں نے یہ ہدایت دی کہ اس آدمی کا پیچھا اس طرح کرو جس طرح تم اس کا پیچھا نہیں کر رہے، دُور دُور سے دیکھو کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ میرے دماغ میں ایک شک پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ آدمی اس وقت موقعۂ واردات سے چلا تھا جب میں نے کھوجی سے کہا تھا کہ تم اپنا کام شروع کردو۔

چوکیدار اس کے پیچھے چلا گیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ گاؤں کے چوکیدار سرکاری ملازم ہُوا کرتے تھے۔ وہ پولیس کے لیے مخبر کا کام بھی کرتے تھے۔ گھر گھر کی خبر رکھتے اور تفتیش میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ پولیس کے ساتھ ہمیشہ وفاداری کرتے تھے۔

"لڑکی شہر سے لائی گئی ہے"

مُکھیا نے کہا ——— "اس لڑکی کو گاؤں والے جانتے ہیں۔ دو تین دفعہ گاؤں میں آچکی ہے۔ اِس دفعہ اسے گاؤں میں نہیں دیکھا گیا تھا۔"

"کس کے ہاں آتی تھی؟"

مُکھیا نے ساجد کی سوتیلی ماں کا نام لے کر کہا ——— "وہ شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔ بیوہ ہوگئی تھی۔ شہر میں ایک رنڈوے سے نکاح پڑھالیا ہے۔ یہ لڑکی اُس کے سوتیلے بیٹے کی بیوی تھی۔ اس آدمی (ساجد) کو ہم جانتے ہیں۔ یہ بھی گاؤں میں آچکا ہے۔ اسی کا سوتیلا بیٹا ہے۔"

مجھے بھونچال کی طرح جھٹکا لگا۔ میرے ذہن سے اُتر گیا تھا کہ

ساجد کی سوتیلی ماں اس گاؤں کی رہنے والی ہے، حالانکہ ابتدا میں مجھے یہ بات بتائی گئی تھی۔ میرا یقین غلط نہیں تھا کہ لڑکی کے اغوا (اور اب قتل) میں سوتیلی ماں کا ہاتھ ہے، بلکہ اس واردات کی تحریک اس عورت سے ہوئی ہے۔

کھوجی نے مجھے بُلایا اور زمین دکھائی۔ کھُرے صاف تھے۔ دو مرد ایک عورت۔ عورت کا کھُرا اُس کے سینڈل کا تھا جس کا تلوا میں نے بھی دیکھا تھا۔ کھُرے گاؤں کی طرف سے آرہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھا پاؤں کے نشان دیکھ رہا تھا تو کسی نے کہا ——— "لڑکی شہر سے اٹھائی گئی ہے۔ کھُرے شہر کی طرف جائیں گے۔"

میں نے دیکھا، مُکھیا کے ساتھ دو آدمی تھے۔ اُن میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ وہ تیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا تھا۔ چہرے، ڈیل ڈول اور باتوں سے ہوشیار اور تیز لگتا تھا۔ میں نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ کھوجی اور اُس کی ماں آگے چلے گئے تھے۔

میں اُٹھا تو اس آدمی نے کہا ——— "گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ معلوم نہیں اسے شہر سے لائے کس طرح ہوں گے۔ بدبختوں نے اتنی دُور لا کر مارا۔"

اس کے بعد یہ آدمی میرے سر پر سوار رہا اور ماہر سراغرسانوں کی طرح مجھے مشورے دیتا رہا۔ کھوجی خاصی دُور نکل گئے تھے۔ وہ گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ اس آدمی نے کہا ——— "آپ یہ کھوجی کہاں سے لائے ہیں؟ یہ تو آپ کو گاؤں کی طرف لے جارہے ہیں۔ گاؤں میں شہری لڑکی کا کیا کام؟"

وہ بلا رُکے بولتا رہا۔ مُکھیا بھی اُسے نہیں ٹوک رہا تھا۔ میں نے اُس آدمی سے پُوچھا ——— "تمہارا کیا خیال ہے کہ گلا گھونٹا گیا ہے؟"

اُس نے استادوں کی طرح کہا ——— "وہ بالکل گلا گھونٹا گیا ہے۔"

یہ کھوجی تو پیسے کھرے کرنے کے لیے آپ کو چکر دے رہا ہے۔ اصل کھرے اُدھر ہوں گے جدھر سے آپ آئے ہیں۔"

کھوجی گاؤں سے کوئی ڈیڑھ فرلانگ دُور رہ گیا تو اُس نے مجھے بلایا۔ کچّی زمین پر اس طرح کے نشان تھے جیسے کسی نے درخت کی شاخ سے جھاڑو دیا ہو۔ کھوجی کی ماں نے کہا — "کھُرے مٹائے گئے ہیں۔"

میرے ساتھ والا آدمی کھوجی سے بولا — "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ لڑکی شہری ہے۔ اسے شہر سے لایا گیا اور یہاں خراب کر کے مارا گیا ہے۔ تم داروغہ صاحب کو گاؤں میں لے جا رہے ہو۔"

کھوجی مسکرایا اور شاخ یا جھاڑو کے جو جھاڑو کی طرح نشان تھے انہیں دیکھتا ہوا آگے چلنے لگا۔ ہم گاؤں کے قریب تھے۔ چوکیدار گاؤں کے باہر کھڑا نظر آیا۔ اُس نے میری طرف آنے کی بجائے بازو اُوپر کر کے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا۔ میں اُدھر چلنے لگا تو اس آدمی کو جو بلا رُکے میرا استاد بن کر بولے جا رہا تھا، میں نے کہا — "آؤ یار، گاؤں میں چلتے ہیں۔ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو" — مُکھیا وغیرہ کو میں نے وہیں رُکنے کو کہا۔ وہ آدمی میرے ساتھ چل پڑا۔

چوکیدار آگے آ گیا۔ مجھے پرے لے جا کر میرے کان میں ایک بات کہی۔ میں نے اُسے کہا کہ جاؤ، ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر گاؤں میں چلے جاؤ۔ میں نے اسے ایک اور ہدایت بھی دی۔ چوکیدار چلا گیا۔ میں اپنے خود ساختہ استاد کو ساتھ لیے گاؤں میں داخل ہو کر ایک جگہ رُک گیا۔

مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر ہیجان طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اس آدمی سے کہا — "مجھے اپنے گھر لے چلو" — اور نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ آدمی صاف ہوتا تو خوشی سے کہتا — "آئیے بسم اللہ" — میں نے ایک پختہ شبے کی وجہ سے اُسے کہا تھا کہ مجھے گھر لے چلو۔

وہ شاید میرا لہجہ اور میری نظریں بھانپ گیا تھا۔ آہستہ سے

بولا — "مجھ غریب کا گھر آپ کے قابل نہیں۔ مُکھیا کی بیٹھک میں چلتے ہیں۔"

"نہیں!" — میں نے کہا — "مجھے تمہارے گھر جانا ہے۔ وہاں بیٹھوں گا۔ مقتولہ کا برقعہ لے کے آ جاؤں گا۔"

اُس کا ردّعمل یہ تھا جیسے میں نے بے خبری میں اُسے سُوئی چبھو دی ہو۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ لڑکی برقعے میں گئی یا لے جائی گئی تھی۔ ساجد کے گھر میں برقعہ نہیں تھا۔ لاش پر بھی برقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص انتہائی احمق تھا جو مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بدمعاش ہو سکتا تھا۔ یہ جرم اس کا پہلا جُرم تھا۔ برقعے کا نام سُن کر وہ چونکا اور جواب دینے کی بجائے احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دوسرا بم پھینکا۔ ساجد کی سوتیلی ماں کا نام لے کر کہا — "تم اُس کے قریبی رشتہ دار ہو یا آشنا؟"

"میرا..... میرا جناب" — مجھے آج تک یاد ہے کہ اُس نے جواب کس طرح دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو ہکلاتا رہا اور بڑی ہی مشکل سے ادھورے ادھورے الفاظ میں اُس نے کہا کہ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں۔ میں نے اُس پر یہ سوال قبل از وقت داغ دیئے تھے۔ اتنے میں کھوجی نے مجھے آواز دی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گاؤں میں آ چکا تھا اور مجھ سے پندرہ بیس قدم دُور کھڑا تھا۔

میں اُس کے پاس گیا تو اس نے پوچھا — "یہ آدمی کون ہے جو آپ کے ساتھ ہے؟ پولیس کا آدمی ہے؟"

"اس گاؤں کا رہنے والا ہے" — میں نے جواب دیا — "پولیس کا آدمی نہیں۔"

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے" — کھوجی نے کہا — "ایک کھُرا اس کا ہے۔ موقعۂ واردات کے قریب میں نے ایک آدمی اور مقتولہ کے کھُرے کے ساتھ اس کے کھُرے دیکھے ہیں۔ اب آپ

اسے ساتھ لے کر ہمارے آگے آگے آتے تو میں اس کے تازہ کھُرے پر آپ کے پیچھے آگیا۔ میں تو آپ کو بھی ملزم سمجھ رہا تھا۔ اس کے کھُرے میں یہ خاص نشانی ہے"۔۔۔۔ اُس نے وہ نشانی مجھے دکھائی۔ تلوے کے درمیان ایک ٹکڑا الگ لگا ہُوا تھا۔ کھوجی نے کہا۔۔۔۔ "آیئے اس کا تلوا دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم اس آدمی کی طرف پیٹھ کر کے باتیں کر رہے تھے۔ گھوم کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ قریب ہی ایک گلی تھی۔ تماشائی مرد، عورتیں اور بچے دُور دُور کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آدمی کہاں چلا گیا ہے۔ بچوں نے بتایا کہ اس گلی میں دوڑ گیا ہے۔ گاؤں کے کسی مرد یا عورت نے نہیں بتایا۔ دیہات میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ گاؤں کے مجرم کو پناہ دے دیتے ہیں۔ اس رویّے کا باعث مجرم اور پولیس کا ڈر بھی ہوتا ہے لیکن اصل باعث یہ ہے کہ وہ دنیاداری کے اصول کے پابند ہوتے ہیں۔ اپنی پنچایت میں مجرموں کو جُوتے مار لیتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے خلاف نشاندہی اور گواہی سے گریز کرتے ہیں۔

فرار اور تعاقب

میں اکیلا ہی اُس گلی میں دوڑ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک بچے کو بازو سے پکڑ کر ساتھ لے لیا۔ اُسے کہا کہ مجھے اس کا گھر بتاؤ۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر گیا ہوگا۔

گھر دُور نہیں تھا۔ گلیوں کے دو موڑ مڑے تو کھُلی جگہ آگئی۔ ایک طرف مکان تھے جن میں زیادہ مکان پکّے تھے۔ بچے نے دُور سے بتایا کہ وہ اس کا مکان ہے۔ وہاں بھی عورتیں اور مرد کھڑے تھے۔

ان سے پوچھا کہ وہ آدمی گھر گیا ہے؟ ایک عورت نے بتایا کہ تھوڑی دیر ہُوئی وہ دوڑتا ہُوا گھر میں داخل ہُوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ مِلا۔ زور سے دروازہ بجایا۔ نہ کھُلا۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔۔۔۔ "دروازہ فوراً کھولو ورنہ گولی مار دوں گا۔" پھر بھی دروازہ نہ کھلا۔

میں نے چوکیدار کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ ایک اور ڈیوٹی پر لگا رکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ قریب ہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر چوکیدار دوڑا آیا۔ اُس نے شاید دیکھ لیا تھا کہ میں دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں اور اندر سے کھل نہیں رہا۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔۔۔۔ "اِدھر آئیں۔"

وہ مجھے ساتھ والے مکان کے اندر لے گیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں گئے۔ دائیں طرف میرے سر سے اُوپر تک دیوار تھی۔ چوکیدار نے کہا۔۔۔۔ "میری پیٹھ پر چڑھ کر دیوار پھلانگیں۔" وہ دوہرا ہو گیا۔ میں اُس کی پیٹھ پر کھڑا ہُوا۔ ریوالور نکال کر منہ میں لے لیا اور دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کُود گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ چوکیدار کس طرح دیوار پر چڑھ کر میرے پیچھے کُود آیا۔

یہ کشادہ صحن تھا۔ سامنے برآمدہ تھا جس میں ایک عورت کھڑی تھی۔ دائیں طرف ڈیوڑھی کا دروازہ تھا۔ ساتھ ایک کمرہ تھا۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا تنور تھا جو گھروں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے تنوری کہتے ہیں۔ تنوری جل رہی تھی۔ وہ روٹی کا وقت تھا۔ تنوری کے قریب چھوٹی سی دیوار تھی۔ میں نے اس عورت سے پوچھا۔۔۔۔ "وہ کہاں ہے؟"

اُس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ آنکھیں ساکن ہو گئی تھیں۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے گرج کر کہا۔۔۔۔ "اُسے باہر نکالو۔" میں برآمدے میں اُس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ بالکل خاموش اور

بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

صحن میں مجھے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی چوکیدار نے کہا ——— "وہ گیا۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ڈیوڑھی کے اندر والے دروازے کی کُنڈی کھول رہا تھا۔ فاصلہ کم و بیش پچیس قدم تھا۔ میں نے اُس کے پیچھے جانے کی بجائے ریوالور کی ایک گولی ہوا میں فائر کی۔ عورت کی چیخ نکل گئی ——— میں للکارا ——— "رُک جاؤ دُوسری گولی آتی ہے۔"

وہ رُک گیا اور گھوم کر وہیں کھڑا رہا۔ میں نے ریوالور کی نالی اُس کی طرف کر رکھی تھی۔ میں نے اُسے کہا ——— "ہاتھ سر پر رکھ کر میرے قریب آؤ۔"

وہ آگیا۔ میں نے اسے پیٹ کے بل برآمدے میں لٹا دیا اور چوکیدار سے کہا کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میں اکیلا تھا۔ گولی چلانے سے میرا مطلب دراصل یہ تھا کہ میرا عملہ سُن لے اور پہنچ جائے۔ اے۔ ایس۔ آئی عثمان تو وہاں تھا ہی نہیں۔ اُسے میں کہہ آیا تھا کہ کاغذی کارروائی کر کے لاش سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائے۔

کالے بُرقعے کا شعلہ

اچانک میری نظر چولہے پر گئی۔ چولہا جل رہا تھا۔ اس پر توا رکھا تھا۔ گوندھا ہُوا آٹا پڑا تھا۔ ساتھ چنگیر تھی جس میں دو تین پُھلکے پڑے تھے۔ ایسی ہیجانی حالت میں بے معنی چیزوں پر نظر ٹکتی ہی نہیں لیکن تفتیش کی کامیابی کا دارومدار انہی بظاہر بے معنی چیزوں پر ہوتا ہے میرا تجربہ ہے کہ اگر آپ کا دماغ اور آپ کی رُوح اپنی ڈیوٹی اور اپنے کام پر مرکوز ہو تو دماغ اپنے آپ آپ کی راہنمائی کرتا ہے۔ میں نے چولہے

پر توا دیکھا، آٹا اور چنگیر دیکھی تو فوراً دھیان تنوری کی طرف گیا اور اس کے ساتھ ہی دھیان لڑکی کے برقعے کی طرف گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ کپڑا جلنے کی بُو آرہی ہے۔

میں نے عورت سے پوچھا ——— "تنوری تم نے جلائی ہے؟"

اُس نے جواب دینے کی بجائے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جسے میں نے لِٹا کر اوپر چوکیدار کو بٹھا دیا تھا۔ یعنی تنوری اُس نے جلائی تھی۔ میں دوڑ کر تنوری تک پہنچا۔ جُھک کر دیکھا۔ تنوری میں کوئی ایندھن نہیں تھا۔ ایک کپڑا جل رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک سوٹی مِل گئی۔ اس سے جلتا کپڑا باہر نکالا۔ میرا ہاتھ بھی جھلس گیا کیونکہ کپڑا سوٹی سے کُھلا تو شعلہ زور سے بھڑک اٹھا تھا۔

میں نے کپڑا باہر پھینکا اور اس پر پاؤں مارے۔ بمشکل نصف گز کپڑے کو میں بچا سکا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ الگ کر کے غور سے دیکھا تو یہ برقعے کے نیچے والا حصّہ تھا۔ اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں کی سلائیاں بتا رہی تھیں کہ یہ برقعہ تھا۔ اتنے میں دو کانسٹیبل ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دیوار پھلانگ کر آگئے۔ وہ گولی کی آواز پر موقعۂ واردات سے دوڑتے آئے تھے۔ مجھ سے پوچھا کہ گولی کس نے چلائی تھی۔ میں نے اُنہیں بتایا۔

اس آدمی کو جسے آپ کہانی سنانے کی خاطر اصغر کہہ لیں، میں نے ایک کانسٹیبل کے حوالے کر کے کہا کہ اُسے یہیں برآمدے میں بٹھائے رکھے۔ دوسرے کانسٹیبل کو اس ہدایت کے ساتھ چوکیدار کے ساتھ بھیج دیا کہ دوسرے آدمی کو بھی یہاں لے آؤ۔ وہ چلے گئے۔ میں نے عورت سے پوچھا کہ وہ اس کی کیا لگتی ہے؟ اُس نے بتایا کہ بیوی ہوں میں نے پوچھا ——— "یہ کالا برقعہ تھا؟"

اس نے خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ جس انداز سے اُس نے خاوند کی طرف دیکھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ

وہ مجھ سے کم اور خاوند سے زیادہ ڈرتی ہے۔ اُس کا خاوند اُس سے دُور تھا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا تو عورت نے سر کے اشارے سے بتایا کہ یہ کالا برقعہ تھا۔

میں نے پوچھا ——— "یہ برقعہ تمہارا تھا؟"

تب اُس نے زبان کھولی اور کہا ——— "میں نے کبھی برقعہ نہیں لیا۔"

اُس سے چند اور باتیں پوچھیں ——— کالا برقعہ صرف شہر میں پہنا جاتا ہے۔ گاؤں میں پُرانے زمانے کا سفید برقعہ استعمال ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ برقعہ مقتولہ کا تھا۔

کانسٹیبل اور چوکیدار دوسرے آدمی کو لے آئے۔ وہ اصغر سے دو چار سال چھوٹا لگتا تھا۔ میں نے اُسے کہا ——— "تم وہ جھاڑی اپنے ساتھ نہیں لائے جس سے تم نے کھُرے مٹائے تھے۔"

"حضورِ انور!" ——— اُس نے غلاموں کی طرح کہا ——— "میں نے کوئی کھُرے نہیں مٹائے۔"

"تمہاری مرضی یار!" ——— میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ——— "ہم تمہاری ہی بات مان لیتے ہیں کہ کھُرے تم نے نہیں مٹائے"

میں نے اسے کانسٹیبلوں کے حوالے کرکے کہا کہ اسے ڈیوڑھی میں بٹھالیں۔ اسے آپ امجد کہہ لیں۔

امجد کون تھا:

یہ وہ شخص تھا جو موقعۂ واردات سے تماشائیوں میں سے نکل کر گاؤں کی طرف چل پڑا، پھر دوڑ پڑا تھا جب میں نے کھوجی سے کہا تھا کہ تم اپنا کام شروع کرو۔ میرے ذہن میں یہ تو نہیں آئی تھی کہ وہ آگے جا کر کھُرے مٹائے گا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں تھا۔ اس کی چال اور رفتار سے مجھے شک ہُوا تھا کہ کوئی خاص بات ہے جس کا تعلق واردات کے ساتھ ہے۔ میں نے چوکیدار کو یہ ہدایت دے کر اس کے پاس بھیجا

تھا کہ اس پر نظر رکھے کہ وہ کیا کرتا ہے؟ گاؤں میں کس سے ملتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ اور اگر چوکیدار ضرورت سمجھے کہ یہ شخص گاؤں سے باہر جا رہا ہے تو اُسے یہ کہہ کر روک لے کہ داروغہ نے بلایا ہے۔

میں اصغر کے ساتھ گاؤں میں گیا تو اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ جھاڑی یا شاخ سے کھُرے مٹائے گئے ہیں اور مٹانے کے نشان تازہ ہیں۔ گاؤں میں چوکیدار نے مجھے اصغر سے الگ کرکے یہ رپورٹ دی تھی کہ وہ گاؤں کی طرف آ رہا تھا تو اُس نے اس آدمی (امجد) کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کی تازہ شاخ ہاتھ میں لیے، چلتے چلتے زمین پر پھیرتا جا رہا تھا۔ وہ اصغر کے گھر تک گیا۔ شاخ باہر پھینکی اور اندر چلا گیا۔ فوراً باہر آگیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے چوکیدار کے ساتھ ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی کہ امجد کے گھر کے پچھواڑے بھی نظر رکھیں۔ اگر وہ نکلنے کی کوشش کرے تو اسے پکڑ لیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ وہ گھر سے نہیں نکلا تھا۔

اب امجد پولیس کی حراست میں ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا اور اصغر برآمدے میں۔ میں نے مُکھیا اور گاؤں کے دو چوہدریوں کو بُلوایا۔ چوکیدار کو بھی ساتھ رکھا۔ ان سب سے اصغر اور امجد کے چال چلن اور سرگرمیوں کے متعلق پُوچھا۔ انہوں نے جو متفقہ رپورٹ دی وہ مختصراً یہ ہے کہ یہ دونوں اچھے چال چلن کے آدمی نہیں تھے، لیکن گاؤں والوں کو ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ آپ کے لیے "شریف بدمعاش" کی اصطلاح عجیب ہوگی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض بدمعاش ایسے ہوتے ہیں جو گاؤں والوں کے لیے شریف اور گاؤں سے باہر بدمعاش ہوتے ہیں۔ یہ دونوں اسی زُمرے میں آتے تھے۔ باہر کہیں جُوا وغیرہ کھیلتے تھے، عادی مجرموں یعنی اونچے درجے کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کی اعانت کرتے تھے۔ سارے گاؤں پر ان کا رعب تھا۔ لٹھ باز بھی تھے، لیکن گاؤں والوں کو اُنہوں نے کبھی پریشان نہیں کیا تھا

نہ بھی کسی سے لڑائی جھگڑا کیا تھا۔ بعض حالات میں گاؤں والے ایسے بدمعاشوں کی پرورش بھی کیا کرتے تھے تاکہ گاؤں چوروں ڈاکوؤں سے محفوظ رہے۔ وہ زمانہ ڈاکوؤں کا تھا۔ بعض اوقات وہ کسی ڈاکو کو پناہ بھی دے دیتے تھے اور چوری کا مال بھی دو چار دن کے لیے رکھ لیتے تھے۔

چوکیدار نے بتایا کہ اصغر بردہ فروشی بھی کر گزرتا تھا۔ چوکیدار کا خیال یہ تھا کہ وہ لڑکیاں اغوا نہیں کرتا، اغوا کی ہوئی لڑکیوں کا سودا کرتا ہے۔ اس نے دو بار اصغر کو آدھی رات کے وقت ایک عورت کو ساتھ لاتے اور اگلی رات لے جاتے دیکھا تھا۔ مقتولہ کے متعلق چوکیدار کو علم نہیں تھا کہ اسے اصغر گاؤں میں لایا تھا یا نہیں۔ کسی کو علم نہیں تھا۔

داستان اُس کی محبّت کی

ساجد کی سوتیلی ماں کے متعلق ان لوگوں نے بتایا کہ وہ اسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ شادی سے چند سال پہلے اُس کے تعلّقات اصغر کے ساتھ تھے۔ بعض لوگ اسے پاک محبت کہتے تھے، بعض ناپاک۔ غالب خیال یہ تھا کہ ان کی محبّت پاک ہے۔ لڑکی دلیر بھی وہ اسے ملتی تھی۔ محبّت اتنی گہری ہوئی کہ لوگ ان کی مثال دینے لگے، مگر ان کی شادی نہ ہو سکی کیونکہ ذات پات کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اصغر نے دھمکی دی تھی کہ وہ لڑکی کو اٹھا لے جائے گا۔ گاؤں کے بڑوں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح سارے گاؤں کی بے عزّتی ہوگی خون خرابہ بھی ہوگا —— وہ مان گیا مگر اُن کی ملاقاتیں جاری رہیں۔

اس عورت کا خاوند بڑا نیک آدمی تھا۔ اُس نے عورت کو طلاق دینے کی بجائے منّتیں کیں کہ وہ اس سے بیوفائی نہ کرے۔

سُنا ہے کہ اس عورت نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ اُس کی خدمت خاطر میں کوئی فرق نہیں آنے دے گی اور اس کے سارے حقوق پورے کرے گی لیکن اصغر سے ملنا ترک نہیں کرے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ خاوند سے اُس نے کبھی بھی بے رُخی نہ برتی، بے وفائی سے بھی باز نہ آئی۔

اصغر کی شادی اس کی برادری میں کر دی گئی۔ اس نے برادری کا کہا مان لیا، مگر بیوی کے ساتھ وہی سلوک کیا جو یہ عورت اپنے خاوند کے ساتھ کر رہی تھی۔ اُس کی بیوی نے اگر احتجاج کیا تو اصغر نے اُس کی پٹائی کر دی۔ پھر وہ ایسی مُردہ ہوئی کہ اصغر کی زرخرید غلام بن گئی۔ دو اڑھائی سال بعد اس عورت کا خاوند ایسے روگ سے مر گیا جسے کوئی سیانا اور ڈاکٹر سمجھ ہی نہیں سکا۔ اصغر نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ اس عورت کو اس کے ساتھ بیاہ دیں لیکن کوئی نہ مانا۔ اب یہ عورت اصغر کی بے نکاحی بیوی بن گئی۔ ایک سال بعد یہ عورت زیادہ کھل گئی۔ اس نے ایک اور آدمی کے ساتھ تعلّقات قائم کر لیے۔ یہ خوبصورت اتنی تھی کہ گاؤں کے زیادہ تر مرد اس کے خلاف بولتے ہی نہیں تھے۔ اس پر ہر کسی کی نظر تھی۔ اس کی بیوگی کے تیسرے سال گاؤں میں اس عورت نے تین چار آدمیوں کو اپنی رقابت میں ٹکرا دیا۔

گاؤں کے بزرگوں نے یہ حال دیکھا تو اس کی دوسری شادی کی سوچنے لگے، مگر گاؤں میں کوئی بھی اسے بیوی بنانے کے لیے تیار نہ ہُوا۔ اُس کے ساتھ دوستی لگانے کی خواہش ہر کسی کے دل میں تھی مگر اسے گھر میں بسانے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ آخر اس برادری کا ایک آدمی شہر میں مِل گیا۔ یہ ساجد کا باپ تھا جس کی عمر اس عورت سے دُگنی تھی۔ اس گاؤں میں ساجد کی ماں کی رشتہ داری تھی۔ گاؤں کے بُزرگ ڈرے ہوئے تھے کہ یہ عورت بوڑھے کو قبول

نہیں کرے گی۔ بڑی عجیب بات ہے کہ اس نے کوئی اعتراض نہ
کیا اور نکاح پڑھا کر شہر چلی گئی۔

اس کے بعد وہ گاؤں میں آتی رہی۔ ایک دو دن رہتی تھی،
مگر یوں لگتا تھا جیسے اصغر سے ملنے آتی ہے۔ پھر وہ اس لڑکی (مقتولہ)
کو دو بار ساتھ لائی اور سب کو بتایا کہ یہ میری بہو ہے۔ آخری بار وہ
گاؤں میں آٹھ دس روز پہلے آئی تھی۔ اب کسی کو علم نہیں کہ یہ لڑکی
گاؤں میں آئی تھی یا نہیں اور وہ گاؤں کے قریب کس طرح مری۔ امجد
کے متعلق ان لوگوں نے بتایا کہ وہ اصغر کا ساتھی ہے۔ وہ گاؤں کی عزت
پر مٹنے والا آدمی ہے مگر چال چلن کا بہت بُرا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے
گاؤں سے باہر کرتا ہے۔

میں نے جب اصغر کی بیوی سے بات کی تو وہ زار و قطار رو
پڑی۔ کہنے لگی کہ وہ مظلوم عورت ہے۔ غریب باپ کی بیٹی ہے۔
اگر اُس نے خاوند کے خلاف زبان کھولی تو وہ اس کی ہڈیاں بھی
توڑ دے گا۔

"تم اس سے طلاق لے کر دوسری شادی کرنا چاہتی ہو؟"
—— میں نے اُس سے پوچھا۔

"طلاق کے لیے تو اُسے سو بار کہہ چکی ہوں" —— اُس
نے جواب دیا —— "یہ مارتا ہے طلاق نہیں دیتا۔ اگر یہ آج
ہی مر جائے تو بھی دوسری شادی نہیں کروں گی۔ باپ جب تک
زندہ ہے اُس کی خدمت کروں گی۔"

"سمجھ لو کہ تمہارا خاوند آج سے مر گیا ہے" —— میں نے
اُسے ہمدردی کے لہجے میں کہا —— "آج سے تمہاری مصیبت
ختم ہے۔ اب چاہے دوسری شادی کرو چاہے باپ کی خدمت کرو۔"

"یہ ظالم اتنی جلدی مر نہیں سکتا" —— اُس نے روتے ہوئے
کہا —— "اس سے تو موت بھی نفرت کرتی ہے۔ اگر میری گردن

پر چھُری پھیر دیتا تو میں اُف نہ کرتی۔ یہ وحشی ایک بدکار عورت کے
ساتھ میرے سامنے اس کمرے میں بند رہتا ہے۔ تین چار دنوں
سے معلوم نہیں کہاں سے ایک بڑی خوبصورت لڑکی لایا تھا۔ اسے
بھی اس کمرے میں بند رکھا۔ میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ تمہارا خاوند اسی لڑکی کے قتل میں
پھانسی کے تختے پر جا رہا ہے۔ یہ اب واپس نہیں آسکے گا۔

وہ اور زیادہ رونے لگی۔ پھر اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ اس
نے ساجد کی ماں کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔
اس عورت کی خاطر اصغر نے اس پر جو ظلم و تشدد کیا وہ بتایا۔ بیوی بیچاری
اس کے قدموں میں سر رکھتی رہی۔ اس نے ساجد کی سوتیلی ماں کے بھی
کئی بار پاؤں پکڑے اور منت کی کہ وہ اس کا سہاگ نہ اجاڑے، مگر
اس عورت کے دل میں ذرہ بھر رحم نہ آیا.... بہرحال اصغر کی بیوی پر
جو بیتی وہ بڑی ہی دردناک کہانی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کالا
برقعہ اس گھر میں کس طرح آیا تھا۔

اُس نے مجھ سے ایک بار پھر پوچھا —— "کیا آپ سچ کہتے
ہیں کہ آپ اسے سُولی پر چڑھانے کے لیے لے جا رہے ہیں؟" ——
میں نے اُسے یقین دلایا تو اُس نے پوچھا —— "آپ اسے میرے
سامنے کیوں نہیں گولی مار دیتے؟ مجھے بھی کچھ سکون ملے۔ آپ نے
گولی چلائی تو میں نے خوشی سے چیخ ماری تھی کہ ظالم ختم ہُوا لیکن وہ
ویسے کا ویسا ہے۔"

میں نے اُسے کہا کہ پھانسی کے بعد اس کی لاش یہاں آجائے
گی، دیکھ لینا۔ تب اُس نے مقتولہ کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔
اُس نے بتایا کہ چار پانچ روز گزرے، رات کے وقت اصغر باہر سے
آیا۔ اُس نے اس لڑکی کو کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ یہ اُسے اس
کمرے میں لے گیا۔ لڑکی کالے برقعے میں تھی۔ باہر آکر مجھے کہا کہ کسی

سے بات کی تو جان سے مار ڈالوں گا۔ میں نے لڑکی کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی اندر سے اس کے رونے کی آواز آتی تھی۔ میں ان کے لیے کھانا پکاتی تھی اور اصغر کھانا کمرے میں لے جاتا تھا۔ رات کو دو بار دو آدمی آئے اور اصغر کے ساتھ کمرے میں چلے گئے۔ وہ تھوڑی دیر ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔ امجد رات کو آتا تھا۔ اصغر لڑکی والے کمرے میں سوتا تھا۔

آج صبح میں جاگ کر باہر آئی تو لڑکی والے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا۔ اصغر بھی نہیں تھا، لڑکی بھی نہیں تھی۔ چارپائی کے سرہانے کالا برقعہ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اصغر آگیا۔ گاؤں میں یہ خبر اُڑی کہ باہر کہیں ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ یہ سُن کر اصغر باہر جانے لگا۔ وہ ابھی صحن میں تھا کہ امجد آگیا۔ دونوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ اصغر سر جُھکا کر سوچنے لگا۔ پھر دونوں باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر ہوئی اصغر دوڑتا ہُوا آیا۔ اُس نے کالا برقعہ اٹھایا، ماچس لی، تنوری کے پاس جا کر برقعے کو آگ لگائی اور تنوری میں پھینک دیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ زبان بند رکھنا ورنہ تمہیں بھی تنوری میں رکھ کر آگ لگا دوں گا۔

میں نے اس مردُود کے ساتھ بات چیت بھی بند کر رکھی تھی۔ آج معلوم نہیں کیوں میری زبان کھل گئی۔ میں نے اس کی دھمکی کے جواب میں کہا —— "تیرے کرتوت میں میری جوتی بھی زبان نہیں کھولے گی، لیکن یہ سُن لے کہ کسی کی بیٹی کے پردے کو تیلی لگا کر تو اس دُنیا میں جہنّم میں جلے گا۔"

وہ مجھے مارنے کے لیے میری طرف بڑھا تو کسی نے بڑی زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ دوڑ کر اس کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ اور زور سے کھٹکا۔ میں چُولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی، چُولہے سے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اس کے بعد آپ دیوار پھلانگ کر آگئے۔

میں نے اصغر کے پاس جا کر پوچھا —— "اقبالِ جرم کرو گے یا پھانسی چڑھنا پسند کرو گے؟"

"حضور والا!" —— اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

دو مرد، ایک عورت

میں ڈیوڑھی میں امجد کے پاس گیا۔ اُس سے بھی یہی سوال پوچھا۔ اُس نے بھی جرم سے انکار کر دیا۔ میں نے اصغر کے گھر کی، خصوصیت سے اُس کمرے کی تلاشی لی جس میں لڑکی کو بند رکھا گیا تھا۔ اندر دیسی شراب کی بُو تھی۔ لڑکی کی چارپائی پر اُس کے تین چار بال تھے۔ کام کی کوئی چیز برآمد ہوئی تو وہ ایک خنجر اور ایک ڈیڑھ فٹ لمبی دودھاری تلوار تھی۔ امجد کے گھر سے بھی کوئی کام کی چیز سوائے خنجر کے برآمد نہ ہُوئی۔

برآمدگی کی کاغذی کارروائی مکمل کی۔ گواہوں کی فہرست تیار کی۔ اُنہیں ساتھ لیا۔ اصغر اور امجد کو ہتھکڑیاں ڈالیں اور یہ قافلہ قصبے کو روانہ ہُوا، مگر میرا اصل مسئلہ تو ابھی حل طلب تھا۔ یہ تھا شہادت اور ثبوت۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ لڑکی کی موت کا باعث معلوم نہیں ہو سکے گا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ملزموں نے اقبالِ جرم نہ کیا تو ثبوت کہاں سے لاؤں گا؟ لڑکی اپنے اغوا کی کہانی بیان نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ماری جا چکی تھی۔ قتل کا عینی شاہد کوئی نہیں تھا۔ اس کی بھی کوئی شہادت نہیں تھی کہ اصغر نے لڑکی کو اپنے گھر چھُپائے رکھا۔ اس کی بیوی کو گواہ کے طور پر تو کورٹ میں لانا ہی تھا، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ملزم عقلمند نکلے تو ان کا وکیل ثابت کر دے گا کہ بیوی کے دل میں اصغر کے خلاف ناچاقی اور کدورت ہے اور وہ انتقاماً جھوٹی گواہی دے رہی ہے۔

میرے پاس اس کا علاج موجود تھا۔ وہ یہ کہ ملزم تین تھے۔ ایک

کو میں وعدہ معاف گواہ بنا سکتا تھا، مگر یہ میرے ایمان کے خلاف تھا۔ میں کسی مجرم کو صرف اس لیے معافی نہیں دلانا چاہتا تھا کہ اُس نے کیس تیار کرنے میں میری محنت بچائی ہے۔ میں حد سے زیادہ محنت کا عادی تھا۔ خدا کی ذات کے سوا میں کسی سے مدد نہیں مانگتا تھا۔ میں دماغ پر پورا زور دینے لگا۔ میرے نیچے گھوڑا چلا جا رہا تھا جس کا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ میں کیس میں غرق ہو گیا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں اصغر اور امجد کو تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ ایک کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا، دوسرے کو دوسری دیوار کے ساتھ۔ سوتیلی ماں کو حوالات سے نکلوا کر کمرے میں بلایا اور اسے تیسری دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے تینوں سے کہا ——— "ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لو تاکہ تمہارے دلوں میں کوئی شک نہ رہے۔ میں تم میں کسی کو وعدہ معاف گواہ نہیں بناؤں گا۔ میرے پاس پورا ثبوت موجود ہے۔ لڑکی گھر سے کس طرح نکلی، گاؤں میں کس طرح پہنچی، کہاں بند رہی، اُسے کس طرح گاؤں سے نکالا گیا اور وہ کس طرح مری۔ اگر کہو تو ساری واردات سُنا دوں۔"

"وہ کیا کہا آپ نے؟ لڑکی مر گئی ہے؟" ——— سوتیلی ماں نے گھبرا کر کہا۔ وہ دیوار سے ہٹ آئی اور بولی ——— "وہ نہیں وہ مری نہیں، آپ غلط کہتے ہیں۔"

"وہ ماری جا چکی ہے" ——— میں نے کہا۔

"وہ ماری جا چکی ہے" ——— اُس نے میرا فقرہ دھیمی آواز میں دُہرایا اور پہلے اصغر کو پھر امجد کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت اور غم تھا۔ اُس نے ایک بار پھر کہا ——— "وہ ماری جا چکی ہے۔ اللہ معاف کرے۔ یہ ظلم کس نے کیا؟" ——— اور اُس کا سر جُھک گیا۔

یہ ہوتا ہے وہ وقت اور یہ ہوتی ہے وہ جذباتی کیفیت جب ملزم کی ذات اور شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ وہ اندر سے بکھر

جاتا ہے۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے ٹکڑے چُن لے۔ وہ سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اُسے سکون اور چین صرف اقبالِ جرم میں ملتا ہے۔ یہ سوتیلی ماں سراپا جنس تھی۔ اس نے گناہوں میں سکون حاصل کیا تھا۔ دو خاوندوں سے بے وفائی کر کے اُس نے لذّت حاصل کی تھی۔ اس کی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ اس کا کوئی ضمیر نہیں تھا۔ وہ ریت کا بُت تھی۔ ہاتھ لگا تو بکھر گیا۔ قتل کے نام سے ہی یہ عورت ختم ہو گئی۔

میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ اصغر اور امجد کو حوالات میں لے جائیں اور سنتری سے کہیں کہ یہ دونوں آپس میں بات نہ کریں۔ اُنہیں لے گئے تو میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے، دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کھڑی تھی۔ میں نے جا کر اُس کا سر اوپر کیا۔ آنسوؤں سے اُس کا چہرہ دُھل گیا تھا۔ اس نے میرے چہرے کو دیکھا۔ میں مُنہ اُس کے منہ کے قریب لے گیا اور کہا ——— "تم قاتل ہو۔"

اُس نے سر ہلا کر کہا ——— "نہیں۔"

میں نے بلند آواز سے کہا ——— "تم قاتل ہو۔"

اُس نے اور زور سے سر ہلایا اور میرے جتنی بلند آواز سے کہا ——— "نہیں۔" وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ اُس کا اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔

میں نے گرج کر کہا ——— "تم قاتل ہو۔"

اُس نے چیخ کر کہا ——— "نہیں۔ میں قاتل نہیں ہوں" ——— اور وہ میرے سامنے گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ اُس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں، بے قابو ہو کر روتے ہوئے اور سر زور زور سے ہلاتے ہوئے اُس نے کہا ——— "میں اُسے مروانا نہیں چاہتی تھی۔ خدا اور رسولؐ کی قسم، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے مار دو۔"

"تم اسے گھر سے غائب کرنا چاہتی تھیں" ——— میں نے

تحمل سے کہا ـــــ "تم اسے اپنے اور ساجد کے درمیان نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔"

اُس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور چارپائی پر بٹھا کر ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے اُس کے دل سے یہ نکالنا مقصود تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں۔ اس کے لیے پانی منگوایا۔ اُس نے وہی سوال پوچھا جو ہر مجرم اقبالِ جرم سے پہلے پوچھتا ہے ـــــ "مجھے کیا سزا ملے گی؟ .... پھانسی یا عمر قید؟"

"اگر میری مدد کرو گی تو جیسی قسم کہو گی کھا کر وعدہ دوں گا کہ نہ پھانسی چڑھنے دوں گا نہ عمر قید ہونے دوں گا" ـــــ میں نے کہا۔

"مجھ سے تم کچھ بھی نہیں چھپا سکو گی۔ میں تمہارے گاؤں سے لڑکی کی لاش لے آیا ہوں۔ سارا گاؤں گواہیاں دینے کے لیے تیار ہے۔ تمہاری وہاں کی زندگی کا ایک ایک منٹ جس طرح گزرا ہے وہ عدالت میں بیان کیا جائے گا۔ اگر تم خود مجھے ساری واردات سُنا دو گی تو تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دوں گا۔ اگر مجھے ساری شہادت لانی پڑی تو کالا پانی پہنچا دوں گا جہاں سے تمہاری لاش بھی واپس نہیں آئے گی۔"

سوتیلی ماں کی رقابت

مختصر یہ کہ میری مسمریزم کام کر گئی۔ کچھ دھمکیوں نے مدد کی کچھ پیار نے، اور وہ اقبالِ جرم پر آمادہ ہو گئی۔ اُس کا پورا اقبالی بیان پیش کروں تو آپ کے کم از کم تین گھنٹے ضائع ہوں گے۔ میں اس کی مجرمانہ زندگی کا مختصر سا خاکہ اور اس کے بیان کے ضروری حصے پیش کر دیتا ہوں۔ وہ اونچی ذات کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ یہ گھرانہ امیر کبیر نہیں درمیانہ درجے کا کاشتکار گھرانہ تھا۔ اس کی محبت اصغر سے ہو گئی جو نیچ ذات کا تو نہیں اس سے کمتر ذات کا تھا۔ اگر ان کے والدین

اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تو ان کی شادی ہو سکتی تھی مگر اُنہوں نے اسلامی رشتے کو الگ کر کے ذات پات کو سامنے رکھا اور نتائج کی پروا نہ کی۔ لڑکی نے مجھے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ شادی سے پہلے اُن کی محبت پاک تھی۔ ان کی مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی۔ اُس وقت تک اصغر نے مجرمانہ زندگی اختیار نہیں کی تھی۔ شادی کے بعد لڑکی خود سر اور اصغر باغی ہو گیا۔ وہ گھر سے غائب رہنے لگا۔ چرس بھی پینے لگا اور اُس کا یارانہ غلط قسم کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا۔

لڑکی نے اپنے خاوند سے کہہ دیا کہ وہ اسے طلاق دے دے یا زہر، وہ اصغر سے الگ نہیں ہو گی۔ اصغر کی آوارگی کا علاج یہ کیا گیا کہ اس کی شادی ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی گئی جو طبیعت کے لحاظ سے اُس کے الٹ تھی۔ وہ تو شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اور زیادہ گھر سے بھاگنے لگا۔ شادی سے پہلے وہ کوئی شریف یا سیدھا سادہ لڑکا نہیں تھا۔ طبیعت اور عقل کا تیز تھا اور سر اونچا رکھتا تھا۔ شادی کے بعد بگڑ گیا۔ لڑکی (سوتیلی ماں) نے اس سے ملنا شروع کر دیا اور وہ ناجائز طور پر میاں بیوی بن گئے۔ اُنہوں نے گاؤں کے بزرگوں اور اپنے والدین کی عزت کی پروا نہ کی۔ اصغر مجرم بنتا چلا گیا۔ اس لڑکی کو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ اصغر بردہ فروشوں کے ساتھ مل گیا ہے اور ڈاکوؤں وغیرہ کے ساتھ بھی اس کا میل جول ہے، لیکن ابھی اس نے اپنے طور پر کوئی واردات نہیں کی تھی۔

لڑکی نے ایک بار اُسے کہا کہ کہیں دُور چلے چلتے ہیں جہاں وہ شادی کر کے رہیں گے۔ اصغر نہیں مانا۔ اُس نے کہا کہ وہ ذات پات کے ٹھیکیداروں کو بتانا چاہتا ہے کہ اُن کی ذاتیں کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ باپ کی زمین کا وارث بھی تھا۔

دو سال بعد یہ لڑکی بیوہ ہو گئی۔ اس نے کہا ـــــ "مجھے اس خاوند کے مرنے کا بہت غم ہے۔ اُس نے میرے ساتھ زبردستی شادی

نہیں کی تھی نہ اُس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں نے شادی سے پہلے اسے زبانی پیغام بھجوا دیا تھا کہ شادی سے انکار کر دو، میں نکاح کے وقت انکار تو نہیں کروں گی لیکن تمہیں دل سے قبول نہیں کروں گی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شادی کی پہلی رات اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور منّت کر کے کہا تھا کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اب اللہ کے نام پر مجھے قبول کر لو۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تم میرے جسم کے مالک ہو، دل کے نہیں۔ وہ بہت شریف اور بھلا مانس آدمی تھا۔ میرے پاؤں کی جُوتی بنا رہا مگر میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ مجھے اصغر پسند تھا۔ شوخ، شرارتی اور دلیر تھا۔ میں نے خاوند کو جلا جلا کے مارا۔ اس نے اُف تک نہ کی اور میری محبّت کا دم بھرتا رہا۔ وہ مجھے طلاق دے سکتا تھا، قتل کر سکتا تھا مگر اُس نے کسی سے شکایت تک نہ کی اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو کھاتا رہا۔ پھر وہ مر گیا۔ میں اس کے مرنے پر خوش نہیں ہُوئی۔ اُس نے جو دُکھ جھیلے ہیں مجھے ان کا بہت دُکھ ہے۔"

اس کے بعد اسے گھر والے اور برادری والے بھی کہتے رہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ وہ نہ مانی۔ گھر والوں کو یہ دھمکی دیتی رہی کہ وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔ عزّت بے عزّتی لڑکی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اسے باپ نے مارا پیٹا۔ اس سے لڑکی اور زیادہ سرکش ہو گئی۔ وہ اصغر سے کھلے بندوں ملنے لگی۔ اُدھر اصغر نے اپنی بیوی کے لیے گھر کو جہنّم بنائے رکھا۔ اس کی تفصیل آپ اس کی بیوی کی زبانی سُن چکے ہیں۔ تین سال کے عرصے میں سوتیلی ماں کی (اپنے بیان کے مطابق) خودسری اور سرکشی جو دراصل گناہ کی لذّت کے سوا کچھ بھی نہیں تھی، اُسے ذلّت کی گہرائیوں میں لے گئی۔ یہاں تک کہ گاؤں کی کسی لڑکی کو والدین اُس سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ عورتیں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ اُسے شدّت سے محسوس ہونے لگا کہ ساری دنیا اور سارا جہان صرف اصغر نہیں ہے۔ گھر والوں نے بھی اسے اچھوت قرار دے دیا۔

ایک وقت تھا کہ اس نے دوسری شادی کا پیغام رعونت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اب یہ وقت آیا کہ اُس نے دوسری شادی کر لینا مناسب سمجھا اور ماں باپ سے کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گی مگر جس سے بات کی، اُس نے اسے فاحشہ اور بدکار کہہ کر تھوک دیا۔ شامت ساجد کے باپ کی آئی۔ اُس کی اس گاؤں میں دور پار کی رشتہ داری تھی۔ اُسے پھانسا گیا۔

اس عورت کو یہ نہ بتایا گیا کہ اس کا ہونے والا دوسرا شوہر بوڑھا ہے۔ اس کی شادی بوڑھے سے کر دی گئی۔ اس دھوکے کا انکشاف پہلے روز ہی ہو گیا۔ اُس نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ بہت ذلیل و خوار ہو چکی ہے، اب اُسے جیسا بھی خاوند ملے گا وہ اُس کی وفادار رہے گی، مگر اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اُسے اس آدمی کے حوالے کر دیا جائے گا جو عمر کے آخری دَور میں داخل ہو چکا ہے۔

وہ بوڑھے شوہر کو دیکھ کر جَل بھُن گئی۔ شادی کی پہلی صبح اُسے ساجد نظر آیا۔ اُس نے اُسی وقت اس پر نظر رکھ لی۔ اُس نے اس رشتے کو قبول ہی نہ کیا کہ ساجد اُس کا بیٹا ہے۔ اس کا جسمانی عیّاشی کا نشہ عود کر آیا۔ اُس نے انسان بننے کا فیصلہ کیا تھا مگر اس دھوکے نے اسے پھر حیوان بنا دیا۔ گاؤں میں وہ بدمعاشوں کی طرح گردن تان کر رکھتی تھی لیکن اس گھر میں آ کر اُس نے فریب کاری کے لیے خلوص اور پیار کا ہتھیار استعمال کیا۔ بوڑھے شوہر کو اپنے پیار اور خدمت خاطر میں اندھا کر دیا۔ ساجد کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ محلّے کی کوئی عورت گھر میں آئی تو اُس نے اس عورت پر اپنی شرافت اور رکھ رکھاؤ کی دھاک بٹھا دی۔

اُس نے ساجد کو جس طرح پھانسنے کی زبانی اور عملی کوششیں کیں ان کی اُس نے پوری تفصیل سنائی لیکن میں یہ تفصیل نہیں سُناؤں گا کیونکہ اس میں زیادہ باتیں شریف گھرانوں میں پڑھنے کے قابل نہیں۔ چند ماہ بعد ساجد کی شادی ہو گئی۔ سوتیلی ماں نے بہو کو بھی پیار کے جال میں

پھانس لیا اور بہو کے باپ، بھائی اور بھابھی پر بھی جادو چلا لیا یہی
وجہ تھی کہ میں اس کے متعلق جس سے بھی پوچھتا تھا وہ اس کی تعریفوں
کے پُل باندھ دیتا تھا۔ اس عورت نے یہ جادوگری صرف ساجد کو
پھانسنے کے لیے کی تھی۔ اس دوران وہ گاؤں جاتی اور اصغر سے
ملتی۔ آدھا آدھا دن اُس کے گھر میں کمرے میں بند رہ کر گزارتی تھی۔
اس کی کوشش یہ تھی کہ اصغر کی جگہ ساجد پوری کرے مگر وہ اس کے
ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اُسے دھتکارتا بھی نہیں تھا۔ شادی کے
سات آٹھ مہینے بعد ساجد کی بیوی نے سوتیلی ماں اور ساجد کو بے تکلفی
کی حالت میں دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس لڑکی (مقتولہ) نے
انہیں کئی بار دیکھا۔

سوتیلی ماں کے بیان کے مطابق، ساجد کی بیوی نے ایک روز
اسے صاف کہہ دیا کہ تم بے شک جوان ہو لیکن یہ نہ بھولو کہ ساجد میرا
خاوند اور تمہارا بیٹا ہے۔ وہ تمہارا خاوند نہیں بن سکتا۔ ساجد نے
بھی دو تین بار سوتیلی ماں سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ بے تکلف
نہ ہُوا کرے کیونکہ بیوی ناراض ہوتی ہے۔ ساجد کی بیوی اور سوتیلی
ماں کی چپقلش بڑھ گئی اور وہ رکاوٹ بن گئی۔

ایک روز ساجد کی بیوی نے اُسے کہا کہ ساجد کا ایک مکان
کرائے پر چڑھا ہُوا ہے، وہ ساجد کو اس مکان میں لے جائے گی
اور ساجد سے کہے گی کہ یہ مکان بھی اپنے نام کرالو۔ سوتیلی ماں نے
ابھی جائیداد کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اس لڑکی نے اس کے ذہن
میں جائیداد ڈال دی، مگر سوتیلی ماں کو دراصل ایک اور آگ جلا رہی
تھی۔ وہ اس نے اس طرح بیان کی:

"ساجد اور اُس کی بیوی اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ایک کمرے میں
سوتے تھے۔ آپس میں ہنستے کھیلتے تھے۔ اُن کی نئی نئی شادی ہوئی
تھی۔ وہ ایک دوسرے کے لیے کھلونے تھے۔ میں جانتی تھی کہ

یہ دونوں ساری دُنیا کے سامنے اکٹھے بیٹھیں، جو جی میں آئے کریں،
ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ وہ میاں بیوی ہیں۔ انہیں دیکھ
کر میرے سینے میں ایک شعلہ اٹھتا تھا جسے ٹھنڈا کرنے کا کوئی
ذریعہ نہیں تھا۔ میرا خاوند میرا ہم عمر ہونا چاہیئے تھا، مگر مجھے بوڑھا
خاوند ملا۔ اس کی محبت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ میں جل جل کر اندھی ہوتی
رہی اور میں عقل کی بھی ایسی اندھی ہوئی کہ جب یہ لڑکی میرے اور ساجد
کے درمیان آنے لگی تو میں نے دل سے کہا کہ ساجد میرا ہے،
اس لڑکی کا نہیں۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ یہ لڑکی ساجد کے
پاس سے اٹھ کر مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔"

آخری فیصلہ، پہلا جرم

اُس نے رقابت کو پیار میں چھپا لیا اور لڑکی کے آگے جھک کر
اُسے پھر اپنا بنا لیا۔ وہ واردات سے دس روز پہلے اصغر کے پاس گاؤں
گئی۔ اُسے کہنا چاہتی تھی کہ ساجد کی بیوی کو غائب کر دو مگر کہہ نہ سکی۔ وہ
پوچھ بیٹھتا کہ کیوں، اس کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟ اس کے
پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اصغر کے ساتھ باتیں کرتے اس پر انکشاف
ہُوا کہ وہ بردہ فروشی بھی کرتا ہے۔ وہ دو عورتوں کو ایک جگہ سے دوسری
جگہ پہنچا کر اُن کا سودا کر چکا تھا۔ اغوا کرنے والے کوئی اور تھے۔ سوتیلی ماں
کو یہ کاروبار اچھا نہ لگا، لیکن اس کے ذہن میں ساجد کی بیوی آگئی۔ اس
نے اصغر سے کہا کہ ایک لڑکی گھر سے بھاگنے کو تیار ہے۔ اُس نے یہ
بھی بتا دیا کہ وہ اس کے سوتیلے بیٹے کی بیوی ہے۔ اتفاق سے یہ لڑکی
سوتیلی ماں کے ساتھ دو دفعہ گاؤں میں آچکی تھی۔ ایک بار اصغر نے بھی
اسے دیکھا تھا۔ اب اُس نے سُنا کہ لڑکی گھر سے بھاگنے کو تیار ہے تو
وہ اس کے اغوا کے لیے تیار ہو گیا۔ سوتیلی ماں نے اصغر کو بتایا کہ لڑکی

اچھے چلن کی نہیں۔ کسی امیر کبیر گاہک کو دو گے تو لڑکی بھی خوش رہے
گی اور تمہیں دام بھی منہ مانگے ملیں گے۔

وہ تیار ہو گیا۔

ہمارے پڑھے لکھے، عقل و ہوش والے قارئین شاید یقین نہ کریں
کہ یہ عورت لڑکی کو اغوا کرانے پر اور اصغر اغوا کرنے پر تیار ہو گیا اور
انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے بعد کیا ہو گا اور وہ کیا کریں گے۔
آپ پر اصغر اور اس عورت کا کیریکٹر واضح ہو چکا ہو گا۔ وہ ان پڑھ اور
کم عقل لوگ تھے۔ حیوانوں کی طرح ان کی ضروریات صرف جسمانی تھیں۔
ان کی عقل جسم کے تابع تھی۔ انہوں نے جسمانی گرمی اور مادیت پرستی کے
تحت ایک ایسے جرم کا فیصلہ کر لیا جس کے بعد کی انہوں نے سوچی ہی
نہیں۔ وہ پکے کار جرائم پیشہ ہوتے ہیں جو ہر جرم کا باقاعدہ پلان بناتے
اور سوچ سمجھ کر واردات کرتے ہیں۔ یہ صرف پولیس والے جانتے ہیں
کہ دیہات کے لوگ کسی جرم کا فیصلہ کر لیں تو پھر آگے پیچھے کی نہیں سوچتے۔
وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ساری دنیا کے بادشاہ ہیں، مگر پولیس کے چکر میں
آتے ہیں تو ایک جھٹکا بھی نہیں سہہ سکتے، فوراً اقبالِ جرم کر لیتے ہیں۔

ان دونوں نے بھی ایک ایسے جرم کا فیصلہ کر لیا جس کے تمام
پہلوؤں پر انہوں نے توجہ ہی نہ دی۔ انہوں نے دن مقرر کر لیا۔ وقت
آٹھ بجے رات رکھا۔ اس دن امجد سوتیلی ماں کے گھر گیا۔ ساجد گھر نہیں
تھا۔ بوڑھا دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ساجد کی بیوی گھر تھی۔ وہ امجد
سے پردہ کرتی تھی۔ سوتیلی ماں نے امجد کو کمرے میں بٹھایا۔ وہ یہ پتہ
کرنے آیا تھا کہ معاملہ تیار ہے یا نہیں۔ سوتیلی ماں نے اسے بتا دیا کہ تیار ہے۔

بدقسمتی سے ساجد کا مکان قصبے کے کنارے پر تھا جہاں سے
کھیت اور خالی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اصغر اور امجد کو وہاں موجود
رہنا تھا۔ رات آٹھ بجے سوتیلی ماں نے ساجد کو الگ کر کے کہا کہ میرا
سر پھٹ رہا ہے۔ دکانیں بھی کی بند ہو چکی ہیں۔ اگر تمہیں کسی حکیم یا

دوائیوں والے کا گھر معلوم ہو تو کوئی گولی لا دو، ورنہ میرے لیے رات
گزارنی مشکل ہو جائے گی۔ اس نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ
تین چار مہینے پہلے تقریباً اسی وقت سوتیلی ماں کو پیٹ میں شدید درد
اٹھا تھا۔ ساجد کسی حکیم کے گھر سے دوائی لے آیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے
بعد واپس آیا تھا۔

اب کے بھی ساجد سر درد کی دوائی لینے چلا گیا۔ ساجد کا باپ
اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ سردیوں کی راتیں تھیں۔ ساجد کی بیوی
کمرے میں تھی۔ سوتیلی ماں نے اسے کہا ——— "وہ تمہارے سسر کے لیے
سویٹر بنانی ہے۔ دن بھر فرصت نہیں ملی۔ آؤ ایک نمونہ لے آئیں۔"
اس نے لڑکی کی ایک سہیلی کا نام لیا۔

لڑکی کی بدقسمتی کہ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے ساجد کے متعلق پوچھا
کہ کہاں ہے تو سوتیلی ماں نے کہا کہ ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔ میرے
لیے سر درد کی گولی لینے گیا ہے۔ اس کے آنے تک ہم واپس آ
جائیں گے۔ لڑکی نے برقعہ اوڑھ لیا اور موت اسے اندھا کر کے
لے گئی۔ سہیلی کے گھر تک قریبی راستہ باہر سے تھا۔ لڑکی نے
کہا کہ ادھر سے ڈر لگے گا لیکن عورت ہنستی کھیلتی اسے اسی طرف
لے گئی۔ اصغر اور امجد وہاں موجود تھے۔ جونہی یہ دونوں گلی سے نکلیں،
سوتیلی ماں ذرا پیچھے ہو گئی۔ اندھیرا تھا۔ وہ کھانسی جو ایک اشارہ تھا۔
اصغر اور امجد نے پیچھے سے لڑکی کے سر پر کپڑا پھینکا۔ کپڑا باندھ دیا اور
انہوں نے اسے اٹھا لیا۔

سوتیلی ماں بڑی تیزی سے واپس گھر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ساجد
گولی لے کر آ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا تو سوتیلی ماں نے
کہا کہ وہ فلاں سہیلی کے گھر سویٹر کا نمونہ لینے گئی ہے..... اس کے بعد
جو کچھ ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ آپ خود تصور کر سکتے ہیں کہ لڑکی رات
بھر نہ آئی تو ساجد، اس کے بوڑھے باپ اور لڑکی کے باپ کا کیا

حشر ہُوا ہوگا۔

"اغوا کی واردات تو کامیاب تھی" ——— میں نے اس سے پُوچھا ——— "اس کے بعد تم نے کیا سوچا تھا؟ ساجد پر قبضہ کرنا تھا؟ اس کے باپ کو ختم کرنا تھا؟ اصغر کے ساتھ بھاگ جانا تھا؟"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھیں لاش کی طرح خالی تھیں۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا اور اُس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اُس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ اُس کا یہ سنگین اور گھناؤنا اقدام جنسیت کی دیوانگی کا کرشمہ تھا۔ جنسی جذبے میں یہی خطرہ ہے کہ جو انسان (مرد یا عورت) اس کا غلام ہو جائے وہ انسان نہیں رہتا۔ اس کی سوچ حیوانوں کی سی ہو جاتی ہے جو دراصل سوچ نہیں ہوتی وہ حیوانی عمل ہوتا ہے۔ یہی حشر اس جوان اور خوبصورت عورت کی عقل کا ہُوا۔ وہ اب سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے اس پر بار بار زور دیا کہ وہ لڑکی کو قتل نہیں کرانا چاہتی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہا ——— "اگر آپ مجھے گرفتار نہ کر لیتے تو لڑکی کا انجام شاید یہ نہ ہوتا۔"

گناہوں کے بُھوت اترنے لگے

میں نے زیادہ کریدا نہیں۔ میرا کام ہو چکا تھا۔ مجھے اب ثبوت فراہم کرنا تھا جو میں نے اُس سے سوالوں کے ذریعے کر لیا۔ اس کی خوب خاطر تواضع کی اور تسلیاں دیں کہ اُسے پوری عزت سے رکھا جائے گا اور اُس کا انجام ایسا بھیانک نہیں ہوگا جیسا وہ سمجھ رہی ہے۔ دراصل انسانی فطرت کے عین مطابق اُس نے سکون صرف اس میں پا لیا تھا کہ اُس کے ضمیر پر گناہوں کا جو بوجھ تھا وہ اُس نے میرے آگے اُگل دیا تھا۔ گناہوں کی پوری داستان سُنا دی تھی۔ میں نے اُسے جھوٹے وعدوں، تسلیوں اور ہمدردانہ باتوں سے اُس کے سکون میں اضافہ کر دیا

اور اُسے حوالات میں بھیج کر اس کے لیے بڑا اچھا بستر بھیج دیا۔

اُس سے فارغ ہُوا تو عثمان نے یہ کہہ کر میری جان نکال دی کہ مقتولہ کی موت کا باعث معلوم نہیں ہو سکا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق گلا نہیں گھونٹا گیا، کوئی آلہ استعمال نہیں کیا گیا، قتل سے فوراً پہلے آبروریزی نہیں کی گئی، تشدّد کے کوئی آثار نہیں، بظاہر قدرتی موت معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے مقتولہ کے جسم کے ضروری حصّے مثلاً تلی، جگر اور دل نکال لیے تھے اور ضلعی شہر میں ایکسپرٹ کے پاس بھیج دیئے تھے۔ اُس نے حرکتِ قلب بند ہونے کا شک ظاہر کیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑی ہی سخت مشکل پیدا ہو گئی تھی۔

رات اڑھائی بجے میں نے اصغر کو حوالات سے جگایا اور تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ اُسے کہا ——— "اپنے جرم کا سارا قصّہ اپنی زبان سے سُنا دو تو سزا میں کمی آ سکتی ہے۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میرا کیس مکمل ہے، ثبوت مل چکا ہے۔ اگر تم نہ بولے اور ثبوت مجھے خود پیش کرنا پڑا تو سزائے موت سے نہیں بچنے دوں گا۔"

وہ نیند میں تھا۔ احمقوں کی طرح مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

میں نے کہا ——— "تم ہو تو استاد مگر جرم ایک ایسی عورت کے ساتھ مل کر کیا ہے جو بیک وقت چھ آدمیوں کی داشتہ ہے۔ تم سمجھتے رہے کہ وہ صرف تمہاری بے نکاحی بیوی ہے۔ اُس نے تمہیں اور امجد کو اُلّو کا پٹھا بنا کر لڑکی تم سے اٹھوا دی اور خود گھر میں بیٹھ گئی۔ جونہی پولیس کے چکر میں آئی اقبالی ہو گئی اور تم دونوں کو ننگا کر کے میرے آگے رکھ دیا۔ جُرم کرنا تھا تو کسی مرد کو ساتھ ملا کر کرتے۔ کہو تو میں تمہیں ایک ایک منٹ کی کہانی سُنا دوں۔ اب تم سیدھے پھانسی کے تختے پر جا رہے ہو۔ میرے ساتھ سَودا کرو۔ پھانسی سے بچنا ہے تو اقبالی ہو جاؤ" ——— اور ایسی بہت سی باتیں تھیں جو میں نے اس سے کہیں۔

یہ باتیں اُس کے لیے نئی ہوں گی کیونکہ وہ پہلی بار پولیس کے جال میں آیا تھا۔ میں تو یہ باتیں کہنے کا عادی تھا۔ تھانیدار ہر مجرم کے ساتھ یہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

میں نے جب کئی بار قتل اور سزائے موت کا نام لیا تو اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ قسمیں کھا کر کہنے لگا ——— "میں نے لڑکی کو قتل نہیں کیا۔"

"کس نے کیا ہے؟"

"کسی نے بھی نہیں" ——— اُس نے کہا ——— "وہ ہمارے ساتھ چلتے چلتے گر پڑی۔ اُسے ہلایا اور اٹھایا لیکن وہ لاش کی طرح بے جان ہو گئی۔ ہم دونوں (وہ اور امجد) اس ڈر سے بھاگ گئے کہ وہ مر گئی ہے۔"

مجھے کچھ ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بتا چکی تھی کہ موت قدرتی ہے۔ ڈاکٹر نے یہ رائے دے کر میرے لیے گنجائش پیدا کر دی تھی کہ حرکتِ قلب بند ہونے کا بھی شک ہے۔ یہ معمہ اصغر ہی حل کر سکتا تھا۔ میں نے اُس پر یہی دباؤ ڈالے رکھا کہ لڑکی اس کے اور امجد کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے اور قتل ثابت ہو چکا ہے۔

میں نے اُسے پریشان کیے رکھا اور اُسے سزا کی تخفیف کا لالچ بھی دیتا رہا۔ ساجد کی سوتیلی ماں کی بتائی ہوئی تین چار راز کی باتیں اُسے بتائیں۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ راز اُس کے سوا کسی کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ اُس نے آخر ہتھیار ڈال دیئے۔ میں نے اُسے صرف زبان کے ہتھیار سے گرایا تھا۔ تھرڈ ڈگری تشدد کی دھمکی بھی نہیں دی تھی۔

اُس نے جو بیان دیا وہ ساجد کی سوتیلی ماں کے بیان کی تصدیق تھی۔ اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے کہا ——— "اس لڑکی کے ساتھ میرے تعلقات بعد میں ناپاک ہو گئے تھے لیکن میں اُسے بالکل اُسی طرح چاہتا تھا جس طرح مجنوں لیلیٰ کو چاہتا تھا۔ اس کی ہر بات اور

ہر خواہش کو میں حکم سمجھتا تھا۔ اُس نے میری محبت کی خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اپنے خاندان کی دشمنی لی، برادری کو اپنا دشمن بنایا پھر سارے گاؤں کی دشمنی برداشت کی۔ گاؤں والوں نے اس پر لعنتیں بھیجیں، اُسے مُنہ پر فاحشہ اور عصمت فروش کہا مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو ان حالات میں میرا ساتھ چھوڑ جاتا۔ اسی بھروسے پر میں نے اس کے ساتھ یہ جرم کیا ہے۔"

اس کے بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ اُس نے لڑکی کو بیچنے کے لیے اغوا کیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس عورت نے اُسے اتنی خوبصورت اور مہنگی لڑکی اغوا کرنے میں مدد دی ہے۔ میں نے اُسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس عورت نے اسے دھوکہ دیا ہے اور وہ لڑکی کو ساجد کے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ اصغر کے بیان کے مطابق، اس عورت نے اسے کہا تھا کہ کہیں دُور لے جا کر بیچنا۔

اصغر نے بیان میں کہا ——— "میں نے اُسے کہا تھا کہ لڑکی کی قیمت میں سے اُسے بھی کچھ رقم دوں گا۔ اُس نے کہا تھا، نہیں، مجھے رقم کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کاروبار میں برکت ہو۔"

اصغر نے اپنی مجرمانہ زندگی کی بہت سی باتیں بتائیں۔ اُس نے کبھی اپنے ہاتھوں کوئی لڑکی اغوا نہیں کی تھی۔ دو عورتوں کی دلّالی کی تھی۔ ایک پارٹی سے لے کر دوسری پارٹی تک اُنہیں پہنچایا اور کمیشن وصول کی تھی۔ اب ساجد کی سوتیلی ماں نے اُسے ساجد کی بیوی کی جھلک دکھائی اور کہا کہ وہ اس لڑکی کے اغوا میں مدد دے گی تو وہ تیار ہو گیا۔ اُس نے امجد کے ساتھ لڑکی کو بالکل اس طرح اغوا کیا جس طرح سوتیلی ماں نے سُنایا تھا۔ لڑکی دُبلی پتلی تھی۔ اصغر اور امجد نے اسے باری باری اٹھا کر گاؤں تک پہنچایا۔ وزن زیادہ نہیں تھا۔ گاؤں کے قریب جا کر دیکھا کہ چوکیدار کہاں ہے۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اصغر

لڑکی کو اپنے گھر لے گیا۔ لڑکی کا منہ کپڑے سے بند تھا۔ کمرے میں لے جا کر اس کا منہ کھول دیا گیا اور بُرقعہ اتار دیا گیا۔

"تم نے اس کی عزت پر تو ضرور ہی حملہ کیا ہو گا" ——— میں نے کہا۔

"بالکل نہیں" ——— اُس نے کہا ——— "میں اتنے بڑے جرم کا اقبال کر رہا ہوں۔ اس چھوٹی سی حرکت کو کیوں چھپاؤں گا۔" اُس نے ساجد کی سوتیلی ماں کا نام لے کر کہا ——— "اس کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ تمہارے سوا کسی غیر عورت کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں نے بہت گناہ کیے لیکن اس عورت کے سوا میں نے کسی دوسری عورت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہاں اُس کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ پھر بھی وہ روتی رہی اور رہائی کے لیے منت سماجت بھی کرتی رہی۔"

اصغر نے بیان دیا کہ اُس نے امجد کو ایک آدمی کے پاس بھیجا۔ یہ آدمی بردہ فروش تھا۔ گاؤں سے دس بارہ میل دُور رہتا تھا۔ اُسے گھر بلا کر لڑکی دکھائی گئی مگر سودا نہ ہو سکا۔ اصغر دس ہزار مانگ رہا تھا اور وہ آدمی سات ہزار سے زیادہ نہیں دے رہا تھا۔ اصغر ایک دو دِنوں بعد سات آٹھ میل دُور سے ایک اور گاہک لے آیا۔ اُس نے لڑکی کو دیکھا اور آٹھ ہزار پیش کیا۔ اصغر نے یہ سودا قبول نہیں کیا۔

اصغر نے امجد کو ساجد کے گھر اس بہانے بھیجا کہ اس کے باپ سے ملے اور کہے کہ شہر کسی کام سے آیا تھا اور خیر خیریت پوچھنے اِدھر آ گیا ہے۔ وہ دراصل یہ دیکھنے آیا تھا کہ لڑکی کی گمشدگی پر یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ یہاں آیا تو اُس نے گھر میں ماتم دیکھا۔ اُسے بتایا گیا کہ لڑکی لاپتہ ہے اور سوتیلی ماں تھانے میں ہے۔ امجد نے اصغر کو جا بتایا کہ

معاملہ گڑبڑ ہے۔ اصغر گھبرا گیا۔ سوتیلی ماں کی گرفتاری اس کے لیے خطرناک تھی۔ وہ لڑکی کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق اسے وہ قتل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے سامنے صرف یہ راستہ رہ گیا تھا کہ لڑکی کو کسی گاہک کے حوالے کر دے۔ گاہک یہی بہتر تھا جس نے آٹھ ہزار روپیہ پیش کیا تھا۔ وہ گاہک سات آٹھ میل دُور بیٹھا تھا۔ اصغر اور امجد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ رات لڑکی کو اس گاہک کے پاس پہنچا دیا جائے۔ وہ اُنہیں کہہ بھی گیا تھا کہ سوچ لو، اگر قیمت منظور رہے تو لڑکی میرے ٹھکانے پر پہنچا دینا۔

لڑکی قتل نہیں ہُوئی

یہ لڑکی کی قید کا چوتھا دن اور پانچویں رات تھی۔ آدھی رات کے بعد جب سب سو گئے تھے، اصغر نے لڑکی کو جگایا اور اُسے ساتھ چلنے کو کہا۔ لڑکی نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور رونے لگی۔ خطرہ تھا کہ وہ شور مچا دے گی۔ اُس کے مُنہ پر کپڑا باندھ دیا گیا اور امجد نے اُسے کندھوں پر ڈال لیا۔ وہ گاؤں سے نکلے۔ کچھ دُور جا کر امجد نے اُسے کندھے سے اتارا اور اُس کے منہ سے کپڑا کھول دیا۔ دونوں نے اُسے دھمکی دی کہ اُس نے اونچی آواز نکالی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

وہ بالکل چُپ ہو گئی۔ اُس نے صرف ایک بار پُوچھا ——— "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

اصغر نے اُسے ڈانٹ کر کہا ——— "زبان بند رکھو۔"

لڑکی پھر نہیں بولی۔ چلتے چلتے اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اصغر نے اُسے دھکیلنا اور ڈانٹنا شروع کر دیا۔ لڑکی چلتے چلتے گر پڑی۔ دونوں نے اُسے اٹھا کر کھڑا کیا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ پھر وہ گر پڑی۔ امجد نے نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا ——— "یہ تو مرنے والی ہے۔"

اصغر نے نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا ——— "معلوم ہوتا ہے مر گئی ہے"
——— دونوں سخت گھبرائے اور وہاں سے گاؤں کو بھاگ گئے۔

صبح کا دھندلکا ابھی صاف نہیں ہُوا تھا کہ گاؤں کا ایک آدمی جو رات بھر اپنی گمشدہ بھینس کو ڈھونڈتا رہا تھا، اُدھر سے گزرا تو اسے لڑکی کی لاش نظر آئی۔ اُس نے گاؤں میں اطلاع دی۔ مُکھیا اور چوکیدار وہاں گئے۔ گاؤں کے کچھ تماشائی بھی چلے گئے۔ اصغر اور امجد دیر سے جاگے۔ اُنہیں پتہ چلا تو وہ بھی چلے گئے۔ مکھیا نے تماشائیوں کو قریب نہیں آنے دیا۔ اصغر اور امجد قریب چلے گئے۔ مجھے رپورٹ ملی تو میں اپنے عملے کے ساتھ پہنچ گیا۔

اصغر نے اعتراف کیا کہ وہ مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ اپنا کام شروع کرے تو اصغر کو ہوش آئی کہ زمین کچّی ہے لہٰذا کھُرے صاف ہوں گے۔ اس سے پہلے اُس کے دماغ میں یہ بات تو آئی ہی نہیں تھی کہ پولیس کھوجی کو بھی ساتھ لائے گی۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا جرم تھا۔ جرم سے پہلے اُس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ کھوجی نے جونہی کھُرے ڈھونڈنے شروع کیے اصغر نے امجد کو پرے کر کے کہا ——— "گاؤں کی طرف جاؤ اور جہاں جہاں اپنے کھُرے نظر آئیں مِٹا دو" ——— امجد دوڑ پڑا۔

اصغر کو معلوم نہیں تھا کہ امجد نے کھُرے مٹائے تھے یا نہیں کیونکہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرنے کے لیے میرے ساتھ لگا رہا اور مجھے یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ لڑکی شہری ہے شہر سے لائی گئی ہو گی، اس لیے کھُرے شہر کی طرف ملیں گے۔ میں انجان بن کے سُنتا رہا۔ وہ بے قابو ہو کر بولتا رہا۔ پھر کھوجی نے اُس کا کھُرا پہچان لیا۔ میں اس سے پہلے بھانپ چکا تھا کہ واردات کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اور میں اُسے اشارہ دے بھی چکا تھا۔ اسی لیے وہ بھاگ گیا تھا۔ اُس نے بھاگنے کی وجہ یہ بتائی کہ اُسے یاد آ گیا تھا

کہ لڑکی کا برقعہ گھر میں پڑا ہے۔ اُس نے گھر جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے سے برُقعہ اٹھایا اور آگ لگا کر تنوری میں پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ فرار ہونا چاہتا تھا۔

اُس کا بیان ختم ہُوا تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ امجد سے بھی کہو کہ اقبالِ جرم کر لے۔ اُس نے کہا ——— "اُس کا اتنا زیادہ قصور نہیں۔ وہ میرا بڑا پیارا دوست ہے۔ اُس نے دوستی کا حق ادا کیا ہے"

میں نے جھوٹا وعدہ کیا کہ میں بھی دوستی کا حق ادا کروں گا۔ امجد کو حوالات سے نکال کر تفتیش کے کمرے میں لایا۔ اصغر نے اُسے کہا ——— "داروغہ صاحب کو سب کچھ بتا دو۔ میں نے بھی بتا دیا ہے" ——— اُس نے میری خوشامد کی خاطر اسے کہا ——— "یہ بڑے رحمدل حاکم ہیں۔ کہتے ہیں کہ سزا میں بہت رعایت دلائیں گے"

امجد نے اُس کے سامنے بیان دینا شروع کر دیا۔ کئی بار اُس نے رُک کر اصغر سے پوچھا ——— "وہ بات بھی بتا دوں؟" ——— اصغر کے کہنے پر اُس نے "وہ بات" بھی بتا دی۔ میں اس قدر خوش تھا کہ اپنے لیے اور اُن کے لیے وہیں ناشتہ منگوایا۔ اس میں انڈے بھی تھے۔ خاصا پُر تکلف ناشتہ تھا۔ مجھے زیادہ خوشی اس پر تھی کہ دونوں میری ضروریات کے مطابق جاہل اور بُدھو تھے۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھ بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ ناشتہ کر کے دوستی گہری ہو گئی۔ میں نے اُنہیں اپنے ساتھ اور زیادہ کھولنے کے لیے فحش مذاق شروع کر دیئے ——— اس ماحول نے مجھے امجد کا بھی اقبالی بیان دے دیا۔ پھر میں نے جرح شروع کر دی جس میں کم و بیش تین گھنٹے صرف ہوئے۔

میں اُسی روز ان دونوں کو اور ساجد کی سوتیلی ماں کو ہتھکڑیوں کے بغیر مجسٹریٹ کے پاس لے گیا۔ اگر ان میں ایک بھی تجربہ کار مجرم ہوتا تو مجسٹریٹ کے سامنے جا کر اقبالی بیان دینے سے انکار کر دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا کیس وہیں ختم ہو جاتا کیونکہ کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی اور سب

سے بڑی کمزوری یہ کہ لڑکی کی موت کو ڈاکٹر نے قتل نہیں کہا تھا —— اللہ نے کرم کیا کہ تینوں نے اقبالی بیان ریکارڈ کروا دیئے۔

میں آپ کو اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ صرف اقبالی بیان کسی کو سزا نہیں دلا سکتا۔ پوری شہادت اور ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی یہ خدشہ شدّت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ملزموں کو دانشمند اور منجھا ہُوا وکیل مل گیا تو وہ سب کو صاف بری کرا دے گا۔ ملزموں کو جوڈیشل (جیل خانے کی) حوالات میں بھیج دیا گیا۔ مجھے اب چالان پیش کرنا تھا۔ تین روز بعد مقتولہ کی لاش کے اندرونی اعضا کی رپورٹ آگئی۔ اُس نے میرے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ کسی ایک بھی عضو سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔ موت قدرتی لکھی گئی۔ میں دفعہ ۳۰۲ (قتل) کا کیس بنانا چاہتا تھا جسے یقیناً ناکام ہونا تھا۔

میں یہ شکست قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے تینوں ملزموں کے خلاف مجرمانہ سازش، اغوا اور قتل کا کیس تیار کیا۔ اصغر اور امجد کے خلاف ایک اضافی دفعہ لکھی۔ یہ تھی آبرو ریزی۔ میں نے اکادن گواہ تیار کیے۔ کچھ اشیاء رکھیں اور ہر پہلو پر خوب غور کر کے مقدمہ قائم کیا۔ یہ تفصیلات بہت ہی طویل ہیں۔ آپ کو سنا کر بور نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کو عدالت کے کمرے کا ایک معرکہ ضرور سناؤں گا۔

قدرتی موت یا قتل

مجسٹریٹ کے سامنے کیس پیش ہُوا تو ملزموں کے وکیل نے کوئی جرح نہ کی۔ کسی گواہ پر کوئی سوال نہ کیا۔ ملزموں نے فردِ جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ انہیں شدید تشدد سے بے حال کر کے لکھے ہوتے اقبالِ جرم پر انگوٹھے لگوائے گئے ہیں۔ ان کا وکیل ہندو تھا۔ مجھے معلوم نہیں اُنہوں نے اتنا مہنگا اور اتنا قابل وکیل کس طرح کر لیا تھا۔

مجسٹریٹ نے کیس سیشن سپرد کر دیا۔ سیشن جج انگریز، فرینک گریگ ہیڈ تھا۔ بڑا ہی سخت اور بال کی کھال اتارنے والا جج تھا۔ وکیل اس کی عدالت میں جانے سے گھبراتے تھے۔ اگر سرکاری وکیل کی کمزوری نظر آجائے تو بھری عدالت میں بے عزتی کر دیتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کیونکہ مجھے ایسے ہی جج کی ضرورت تھی۔ ہمارا سرکاری وکیل کلکتے کا رہنے والا این۔ وی۔ موجمدار تھا۔ سیشن کورٹ میں جاتے ہی تینوں ملزموں نے جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اُن سے اسی رویّے کی توقع تھی۔ میں اس صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اُن کے وکیل نے انہیں نہایت چابکدستی سے تیار کیا تھا۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ موت کا باعث معلوم نہیں ہو سکا۔ میرے گواہوں پر اس کی جرح اسی لائن پر چل رہی تھی۔ مجھ پر وہ دو دن جرح کرتا رہا تھا۔

اصل کمزوری پوسٹ مارٹم رپورٹ اور ماہرین کی رائے تھی۔ اگر کوئی اور سیشن جج ہوتا تو کیس بری کر دیتا۔ یہ جج میری شہادتوں کو نظر انداز نہ کر سکا۔ سرکاری وکیل نے یہ نکتہ اٹھایا کہ لڑکی کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ہے اور حرکتِ قلب اُس دہشت انگیز سلوک سے ہوئی ہے جو ملزموں نے اس پر روا رکھا۔ ڈاکٹروں پر اس بنگالی وکیل نے جو جرح کی وہ میری سروس کی سب سے زیادہ دانشمندانہ جرح تھی اور حیران کن بھی۔

ڈاکٹروں نے کہا کہ ہائی بلڈ پریشر یا خون کی رکاوٹ (کلاٹنگ) سے جب حرکتِ قلب بند ہوتی ہے تو دل اور دل سے ملنے والی نالیوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ دل کی حرکت بند ہو گئی تھی مگر دہشت اور تشدد یا مسلسل ذہنی اذیت سے حرکتِ قلب بند نہیں ہُوا کرتی۔

ہمارے وکیل نے سوال کیا —— "کیا یہ میڈیکل سائنس کا فیصلہ ہے یا آپ کا ادھورا تجربہ؟"

"میں نے ایسی موت جو دہشت سے واقع ہوئی ہو کبھی نہیں

دیکھی"۔۔۔۔۔۔ ایکسپرٹ نے کہا۔

"یوں کہیئے کہ آپ نے نہیں دیکھی"۔۔۔۔۔۔ وکیل نے کہا اور ڈاکٹری کی ایک کتاب نکال لی۔ اس میں سے اُس نے کورٹ کو ایک صفحہ پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا کہ دہشت اور ذہنی اذیّت سے حرکتِ قلب بند ہو سکتی ہے مگر ایسے کیس کم ہوتے ہیں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ انسان پہلے بے ہوش ہوتا ہے۔ بے ہوشی سے سنبھل بھی جاتا ہے۔ اگر نہ سنبھلے تو حرکتِ قلب بند ہو سکتی ہے۔

سیشن جج نے دلّی سے ایک انگریز ڈاکٹر ڈبلیو۔ کلارک کو بلالیا۔ وہ کوئی ماہر تھا اور سرکاری ڈاکٹر۔ اس کی رائے لی گئی۔ اس نے وہ حالات بیان کیے جن میں دہشت سے حرکتِ قلب بند ہو سکتی ہے۔ اس نے دو تین مثالیں بھی پیش کیں۔ صفائی کے وکیل نے اس پر بہت جرح کی لیکن یہ انگریز ڈاکٹر بہت ہی قابل تھا۔

میں نے ایسے گواہ پیش کیے تھے جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ لڑکی کو مسلسل دہشت اور اذیّت میں رکھا گیا تھا۔ ملزموں نے بے شک اقبالِ جرم سے لاتعلقی ظاہر کر دی تھی لیکن شہادت کے سامنے ان کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ ساجد کی سوتیلی ماں نے اپنے وکیل کے کہنے پر مجھ پر بڑے ہی شرمناک الزام عاید کیے تھے مگر ہمارا پلّہ بھاری رہا۔

ہمارا سرکاری وکیل بہت ہوشیار تھا۔ آخر میں اُس کی بحث سننے کے قابل تھی۔ اُس نے ڈاکٹر ڈبلیو کلارک کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ لڑکی کو قید میں رکھا گیا۔ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ اُس کا انجام کیا ہوگا۔ ملزموں نے اس کے ساتھ وحشیوں کا سلوک کیا۔ پھر ملزموں کے اپنے بیان کے مطابق وہ لڑکی کے منہ پر کپڑا باندھ کر رات کی تاریکی میں ایسی منزل کی طرف لے چلے جس کے متعلق اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ کیا ہوگی۔ اُنہوں نے اسے پیدل چلایا، اُسے ڈانٹا۔ وہ شہر کی کمزور سی لڑکی ویران علاقے میں ان دو درندوں کے ساتھ اندھیرے میں جا رہی تھی۔ اسے اس قدر دہشت زدہ

کرنے کے لیے کہ اُس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتے، اور کس چیز کی ضرورت تھی؟ ملزموں کے اقبالی بیان میں اور میری جرح کے جواب میں اُنہوں نے خود ثابت کر دیا ہے کہ لڑکی پہلے بیہوش ہوئی۔ وہ اسے بیہوشی کی حالت میں چھوڑ کر بھاگ آئے اور وہ مر گئی۔ اُس کی موت کے ذمّہ دار یقیناً یہی لوگ ہیں۔ اگر لڑکی کو سانپ ڈس لیتا یا کوئی درندہ اس پر حملہ کر دیتا تو ملزموں پر دفعہ ۳۰۲ عائد نہیں کی جا سکتی تھی، لیکن وہ ان کے ہاتھوں میں ان کے پیدا کیے ہوئے حالات میں مری۔ یہ جرم دفعہ ۳۰۲ میں آتا ہے۔

صفائی کے وکیل نے بھی نہایت اچھے دلائل دیئے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ یہ لوگ اَن پڑھ ہیں۔ اگر قابلِ احترام عدالت یہ تسلیم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے کہ لڑکی کی موت ملزموں کی پیدا کردہ دہشت کے زیرِ اثر حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوئی ہے تو عدالت کو یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ اَن پڑھ اور گنوار ملزم ڈاکٹر ڈبلیو کلارک کے اس فلسفے سے بالکل آگاہ نہیں تھے کہ اِن حالات میں لڑکی مر جائے گی۔ ان کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ یہ موت اتفاقیہ یا حادثے کے طور پر واقع ہوئی ہے۔

سیشن جج نے اصغر اور راجد کو دس دس سال سزائے قید اغوا میں اور عمر قید عبور دریائے شور (کالا پانی) قتل میں دی۔ آبرو ریزی کا جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ ساجد کی سوتیلی ماں کو دس سال اغوا میں اور تینوں ملزموں کو دس دس سال مجرمانہ سازش میں دی۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی جو مسترد ہو گئی۔

★ ★